ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

بچوں کا اسلام

روزنامہ اسلام

591 اتوار 14 ذی الحجہ 1434ھ مطابق 20 اکتوبر 2013ء

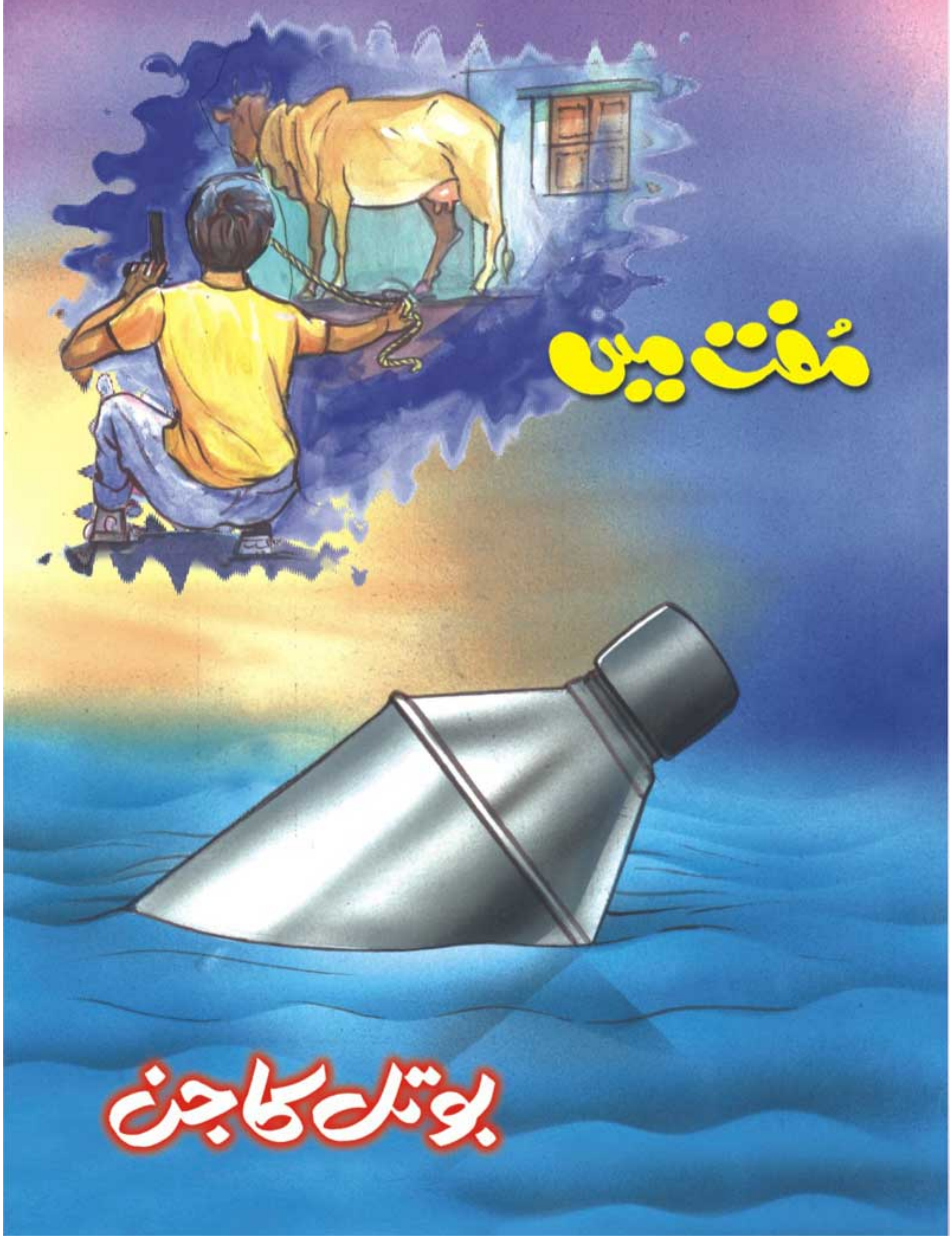

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کی طرف سے

”تمھیں جو کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو وہ صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو کوئی برائی پہنچتی ہے، وہ تو تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے، اور (اے پیغمبر) ہم نے تمھیں لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ (اس بات کی) گواہی دینے کے لیے کافی ہیں۔ (سورۃ النساء:79)

عذاب کا ٹکڑا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”سفر عذاب کا ٹکڑا ہے، تم میں سے ایک کو اس کی نیند اور اس کے کھانے اور پینے سے روک دیتا ہے، جب کوئی سفر میں اپنی حاجت کو پورا کر لے، جلد اپنے گھر لوٹ آئے۔ (بخاری۔مسلم)

دو باتیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ: سالنامے کے خطوط کی آمد آمد ہے... رنگ برنگے خطوط موصول ہو رہے ہیں... ہمارے ایک لکھنے والے ہیں نورالامین ... بلکہ یہ لکھنے والے تو بعد میں ہیں، بچوں کا اسلام کے قاری پہلے ہیں اور ظاہر ہے... پہلے بندہ قاری ہی بنتا ہے، لکھنے کی تو بعد میں سوچتا ہے... کچھ یاد پڑتا ہے... نورالامین صاحب نے دو سال پہلے کے سالنامے کے بارے میں جو تبصرہ کیا تھا، وہ قرآنِ کریم کی مدد سے کیا تھا... ان کا وہ تبصرہ مجھے بہت اچھا لگا تھا... مجھے ہی نہیں، تمام قارئین نے پسند کیا تھا...

اس بار انھوں نے ایک بہت ہی انوکھی کوشش کی ہے... ان کی یہ کوشش میرے سر پر سے گزر گئی... سر پر سے گزرنے کا مطلب آپ جانتے ہی ہوں گے ... یعنی میرے دماغ میں داخل نہیں ہو سکی... اوپر اوپر سے گزر گئی ہے... اب انھوں نے تو کی تھی بہت بڑی کوشش اور بہت محنت ... لیکن جب وہ میرے سر پر سے گزر گئی تو مجھے بہت افسوس ہوا... کسی کی محنت ضائع چلی جائے... میں اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا، لہٰذا میں نے انھیں فون کیا اور ان سے درخواست کی، آپ اپنے خط کا ترجمہ بھی کر دیں تا کہ ہم آپ کے خط کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی شائع کر سکیں اور آپ کا خط ہر شخص آسانی سے سمجھ لے... ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی ان کے خط کی عبارت کے معانی نہیں کر سکا... یا کم از کم سارے خط کے معانی نہیں کر سکا...

کچھ مدت پہلے ایک کتاب سیرت النبی پر شائع ہوئی تھی، اس کتاب کے مؤلف نے کوشش یہ کی تھی کہ پوری کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں تھا جو نقطے والا ہو... یعنی انھوں نے تمام بے نقط حروف کے ذریعے اپنی کتاب مکمل کی تھی... اب ظاہر ہے، اس کام میں انھیں دانتوں پسینہ آیا تھا...

لگتا ہے... نورالامین صاحب بھی دانتوں پسینے کے شوقین ہیں... انھیں ان کا شوق مبارک ہو... ویسے میں کاموں میں آسان کام کو پسند کرتا ہوں... مشکل کام کرنا پسند نہیں کرتا... ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی بات کو پسند فرماتے تھے... یعنی مشکل کام کے مقابلے میں آسان کام کو ترجیح دیتے تھے... ہاں مجبوری ہو تو اور بات ہے... اگر کوئی مجبوری نہیں تو پھر آسان کام کرنا بہتر ہے اور دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہی اچھا ہے...

سالنامے کے بارے میں مجموعی رائے یہی ہے کہ گذشتہ تمام سالناموں سے یہ سالنامہ بہتر رہا... یوں کہنے والے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک سالنامہ بالکل پھیکا تھا... لیکن مجھے ایسے لوگوں کی ذرّہ بھر پروا نہیں... مجھے تو اپنا کام کرنا ہے اور پوری دیانت اور لگن سے کرنا ہے... بہتر سے بہتر کہانیوں کا انتخاب کرنا ہے... اب بہتر سے بہتر کہانیاں بھی اگر لاکھوں پڑھنے والوں میں سے چند ایک کو بالکل پھیکی لگیں تو انھیں چاہیے... وہ ایسی کہانیاں لکھ کر ارسال کریں... جنھیں کوئی پھیکا نہ کہہ سکے... میں ان کا شکر گزار ہوں گا اور ان کی کہانیاں خوب دھوم دھام سے شائع کر دوں گا یعنی باقاعدہ نوٹ لکھ کر شائع کروں گا جیسا کہ آپ نے ماوراگل کی ایک کہانی پر نوٹ پڑھا ہوگا... آپ اس کہانی کو پڑھ کر دیکھ لیں... ایک انوکھی خوشی کا احساس ہوتا ہے یا نہیں... میرے نزدیک تو کہانی ایسی ہونی چاہیے شکریہ!

والسلام

سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک: 600 روپے، بیرونِ ملک: 3700 روپے

خط کتابت کا پتہ

”بچوں کا اسلام“ دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983

بچوں کا اسلام انٹرنیٹ پر بھی: www.dailyislam.pk ای میل: bkislam4u@gmail.com

سفر کی تیاری اور تین ناشتے

مولانا محمد ہاشم عارف۔ کراچی

جب بھی کسی ملک کا سفر درپیش ہوتا ہے تو سب سے پہلے مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب جہاں دیدہ یا دنیا مرے آگے سے رہنمائی لیتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحب کی خصوصیت یہ ہے، اس ملک میں موجود اسلامی مقامات اور ان کے محل وقوع کو اس تفصیل سے بیان فرماتے ہیں کہ اگر ان کے بعد کوئی وہاں جا کر اس مقام تک پہنچنا چاہے تو آرام سے پہنچ سکے، چنانچہ مصر کے لیے بھی جہاں دیدہ سے خوب رہنمائی حاصل کی اور خاص مقامات کو ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ دوسرا ذریعہ گوگل ارتھ ہے۔ سیٹلائٹ تصاویر کے ذریعے اس سافٹ ویر کی مدد سے دنیا کے کسی بھی حصے اور مقام سے آپ باآسانی آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ڈائری میں موجود لکھے گئے مقامات کو گوگل ارتھ سے تلاش کیا اور ان کی نشاندہی بھی کی اور ان کی تصاویر اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کر لیں۔ احتیاطاً ان کے پرنٹ آؤٹ بھی کر لیے، تاکہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر کام آسکیں۔

تیاری کا تیسرا ذریعہ "وکی پیڈیا" ہے جس سے آپ کسی بھی شہر اور مقام کی مکمل معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ وہاں کا موسم کیسا ہے۔ ٹرانسپورٹ کے کیا ذرائع ہیں۔ کون سا ذریعہ سستا ہے۔ کھانے پینے اور رہائش کے کون کون سے مقامات ہیں۔ کون سے علاقے محفوظ ہیں۔ اس شہر کے تاریخی اور تفریحی مقامات کہاں کہاں پر ہیں۔ لوگ کیسے ہیں۔ اسی طرح بہت ہی مفید مشورے بھی اس سائٹ کے ذریعے آپ حاصل کر سکتے ہیں۔

ان تینوں ذرائع سے فائدے اٹھانے اور کئی سفروں کے بعد الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ بہت سے مقامات پر بغیر کسی مقامی راہنمائی کے خود ہی پہنچ جاتا ہوں۔ اگر کوئی دوسرا ساتھ ہو تو وہ بہت حیران ہو جاتا ہے کہ تمہیں کیسے پتا چلا۔ ایک جگہ تو ٹیکسی ڈرائیور کی میں راہنمائی کر رہا تھا کہ اب یہاں جاؤ اور اب ایسے جاؤ تو وہ حیرت سے پوچھنے لگا، "کیا آپ پہلے بھی آچکے ہیں۔"

میں نے جواب دیا:

"نہیں! پہلی مرتبہ آیا ہوں۔" تو وہ اور زیادہ حیران ہوا۔

17 جون کی صبح پانچ بجے ایمرٹس ایرلائن کے ذریعے دبئی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دبئی سے قاہرہ کی فلائٹ تھی۔ رات ڈھائی بجے گھر سے نکلنا طے ہوا۔ عشاء کے بعد تیاری وغیرہ سے فارغ ہو کر جلدی سو گیا، ڈیڑھ بجے اٹھا تو اہلیہ نے ناشتا سامنے رکھ دیا کہ معلوم نہیں کب کھانا ملے، لہٰذا ناشتا کر کے جائیں۔ ہم نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سب چٹ کر گئے۔ ٹھیک ڈھائی بجے عمر صاحب ٹیکسی لے کر پہنچ گئے۔ ہم اپنی فلائٹ کے ایمیگریشن ٹائم سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا بنچوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ آس پاس نظر دوڑائی تو چند چینی بھائی نظر آئے۔ جب ایمیگریشن کاؤنٹر کھلا تو یہ چینی حضرات قطار میں ہمارے پیچھے کھڑے ہو گئے اور مدد کے طالب نظر آئے۔

پوچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ دبئی سے بیجنگ کی اتصالی فلائٹ ہے اور اپنا سامان ڈائریکٹ بیجنگ کے لیے بک کروانا چاہ رہے ہیں، تاکہ دبئی میں ائیرپورٹ پر دوبارہ سامان وصول کرنا اور پھر جمع کروانے کی زحمت سے بچ سکیں۔ عمر کا تو ویسے بھی چائنا آنا جانا کافی تھا، فوراً آگے بڑھے اور کاؤنٹر پر ان کی مطلوبہ درخواست پہنچا دی۔ میں نے قطار سے اپنی ٹرالی ہٹا کر مؤدبانہ انداز میں آگے آنے کی دعوت دی کہ پہلے آپ اپنا کام کروالیں۔ ہم تو بعد میں بھی کروا سکتے ہیں۔ اپنا ملک جو ہوا۔ اپنا ملک اپنا ہوتا ہے، جیسا کیسا بھی ہو۔ بیرون ممالک کے بارہا سفر سے اجنبیوں کی اجنبیت اور اپنوں کی اپنائیت کا احساس بہت گہرا ہو چکا ہے:

چائنیز اپنا کام کروا چکے تو ان سب نے ایک گروپ کی صورت میں آکر ہمارا شکریہ ادا کیا اور اپنے بیگ سے چند ننھے پیکٹ نکال کر تحفتاً ہمیں پیش کیے جو ہم نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیے۔

تحفے قبول تو کر لیے، لیکن پھر احساس ہوا کہ کسی سے بھی دورانِ سفر کسی بھی قسم کا تحفہ یا ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہیے، لہٰذا فوراً ان ڈبوں کو کھول کر چیک کیا تو معلوم ہوا کہ چائنا کا مشہور درد کش تیل ہے جو پٹھوں کے کھچاؤ کے وقت بہترین دوا ثابت ہوتا ہے۔ چیک کرنے کے بعد بیگ کی بیرونی جیب میں رکھ دیا کہ آگے سفر میں چلنا بہت ہے، کام آئے گا اور پھر بہت کام آیا۔ کوہِ طور کے سفر میں جس کی تفصیل آپ پچھلے شماروں میں پڑھ چکے ہوں گے، اس سے واپسی پر ہم دونوں نے اپنی پوری ٹانگوں کی اس سے مالش کی۔ حیرت انگیز طور پر ایک ہی دن میں کافی افاقہ ہو گیا۔

فجر کی نماز کے بعد ٹھیک وقت پر ہماری فلائٹ دبئی کے لیے روانہ ہوئی۔ ڈیڑھ سے دو گھنٹے کے اس سفر میں ہماری مہمان نوازی ناشتے سے کی گئی۔ ٹائم چونکہ ناشتے کا ہی تھا۔ دبئی ائیرپورٹ پر قیام صرف سوا گھنٹے پر مشتمل تھا۔ دبئی کے مقامی وقت کے مطابق 8:30 ساڑھے آٹھ بجے مصر کے دارالحکومت قاہرہ کے لیے فلائٹ تھی۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے جہاز دبئی سے روانہ ہو چکا تھا۔ چار گھنٹے کے اس سفر میں چونکہ اب تک دوپہر کے کھانے کا وقت نہیں ہوا تھا، اس لیے مہمان نوازی کے طور پر ایک بار پھر ہمارے سامنے ناشتا تھا۔ دل تو چاہا کہ زور سے چیخ کر کہوں کہ کتنی بار ناشتا کرواؤ گے! لیکن یہ ہمارا گھر نہیں تھا جہاں ہماری بات سنی جاتی، لیکن چھوڑا ہم نے بھی نہیں ایک ایک چیز کے ساتھ مکمل انصاف کیا۔ سفر انسان کو بہت کچھ سکھاتا ہے، ان اسباق میں ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ سفر کے دوران کھانا سامنے آجائے تو اچھی طرح کھالو اور جب نہ ملے تو پھر صبر کرو، لہٰذا اگلی قسط کے لیے آپ بھی تھوڑا صبر فرمائیں۔ والسلام!

مسائل کی باتیں

سوال: عمل تو کیا جاتا ہے خاص اللہ کے لیے، لیکن اگر کوئی اس حالت میں عمل کرنے والے کو دیکھ لے یا کسی طرح لوگوں پر ظاہر ہو جائے تو آدمی کا دل اندر سے خوش ہو جاتا ہے۔ اس کو ریا (دکھاوا) یا چھوٹا شرک سمجھا جائے گا یا کچھ دوسرا حکم ہے۔

جواب: یہ ریا نہیں ہے، نہ اس میں کچھ گناہ ہے، بلکہ دو چند اجر ملتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ نیت خالص ہو۔ اگر ارادۃً کسی ایسی جگہ پر عبادت کی کہ کوئی دیکھ لے یا ایسی تدبیر کی کہ وہ عملِ خیر لوگوں میں شہرت پا جائے تو یہ صاف ریاء ہوگا۔ جسے حدیث میں شرکِ اصغر کہا گیا ہے۔

اس بارے میں حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! "میں بعض دفعہ عمل (خالص نیت سے) کرتا ہوں اور کسی طرح لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے تو میرے دل کو یہ بات بہت بھلی لگتی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تمہیں دو اجر ملیں گے۔ ایک ظاہر کا ثواب، ایک پوشیدہ عمل کا۔" (ابن ماجہ، ترمذی)

آصف محمود قاسمی۔ لاہور

واقعاتِ صحابہ کے 81

عبداللہ فارانی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا۔ اس کے بارے میں آپ کو بتایا گیا:

''اس نے اونٹ چوری کیا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

''میرے خیال میں تو تم نے چوری نہیں کی۔''

اس نے جواب میں کہا:

''جی نہیں! میں نے چوری کی ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''شاید تمہیں شبہ ہو گیا ہو۔'' (کہ تمہارا اونٹ ہے یا کسی اور کا)

اس نے کہا:

''نہیں! میں نے چوری کی ہے۔''

اب آپ نے اپنے خادم سے فرمایا:

''اے قنبر! اسے لے جاؤ۔ اس کی انگلی باندھ دو، آگ جلالو اور جلاد کو ہاتھ کاٹنے کے لیے بلالو اور میرے واپس آنے کا انتظار کرو۔''

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس آئے تو اس سے پوچھا:

''تم نے چوری کی ہے۔''

اس نے کہا:

''نہیں!''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب سن کر اسے چھوڑ دیا۔ اس پر لوگوں نے کہا:

''اے امیر المومنین! جب وہ ایک دفعہ آپ کے سامنے چوری کا اقرار کر چکا تھا تو پھر آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا۔''

آپ نے فرمایا:

''میں نے اسی کی بات پر اسے پکڑا تھا اور اسی کی بات پر اسے چھوڑ دیا۔''

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جس نے چوری کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس کا ہاتھ کاٹا جانے لگا تو آپ رو پڑے، میں نے آپ سے پوچھا، آپ کیوں رو رہے ہیں۔''

قدم بہ قدم

آپ نے فرمایا:

''میں کیوں نہ روؤں! جب کہ میرے امتی کا ہاتھ میرے سامنے کاٹا جا رہا ہے۔''

لوگوں نے کہا:

''تو آپ نے اسے معاف کیوں نہ کر دیا۔''

آپ نے فرمایا:

''وہ بہت بُرا حاکم ہے جو شرعی سزا معاف کر دے۔ ہاں تم لوگ آپس میں یہ جرائم معاف کر دیا کرو۔''

مطلب یہ کہ شرعاً جرم ثابت ہونے کے بعد حاکم معاف نہیں کر سکتا۔

o

ایک شخص اپنے بھتیجے کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر آیا۔ اس کا بھتیجا نشے میں تھا۔ اس آدمی نے بتایا:

''میں نے اسے نشے میں مدہوش پایا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اسے خوب اچھی طرح ہلاؤ اور جھنجھوڑو اور اس کے منہ کو سونگھو۔''

لوگوں نے اسے خوب ہلایا، پھر اس کے منہ کو سونگھا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے جیل میں ڈالنے کا حکم دیا۔ دوسرے دن اسے جیل سے باہر نکلوایا۔ پھر آپ نے فرمایا:

''کوڑے کی گانٹھ کو کوٹ دو تا کہ وہ چابک جیسا ہو جائے۔''

چنانچہ کوڑے کو کوٹ دیا گیا۔ پھر جلاد سے فرمایا:

''اسے مارو، لیکن ہاتھ اتنا نہ اٹھاؤ کہ بغل نظر آنے لگے (یعنی زور سے نہ مارو) یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے اس طرح کوڑے لگوائے جو زیادہ سخت نہیں تھے۔ کوڑے

حج و زیارات کتب پیکیج

دو کتابوں اور تین سی ڈیز کا خوبصورت مجموعہ

رنگین تصاویر کے ساتھ

کل قیمت 450 روپے

رعائتی قیمت 400 روپے

ڈاک خرچ مفت

ملنے کے پتے:

1- ملتان 0300-7301239
2- راولپنڈی 0321-5123698
3- پشاور 0314-9696344,091-2580331
4- بہاولپور 0333-6367755,0622731947
5- اٹک 0302-5475447
6- لاہور 0321-4538727
7- فیصل آباد 0321-7693142
8- ساہیوال 0321-6950003
9- کوئٹہ 0321-8045069
10- رحیم یار خان 0321-2647131
11- ہری پور 0301-8145854
12- سرگودھا 0321-6018171

دوکان نمبر 11، اسلام کتب مارکیٹ، نزد جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی رابطہ نمبر 0314-2139797 (کراچی)

مارتے وقت جلاد کا ہاتھ بھی زیادہ اوپر نہیں اٹھتا تھا۔ کوڑے لگائے جانے کے وقت اس شخص نے جبہ اور شلوار پہنی ہوئی تھی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''یہ شخص بُرا ہے۔''

پھر اس سے فرمایا جو اسے لے کر آیا تھا۔

''اے شخص! تم نے اسے تمیز نہیں سکھائی۔ اسے اچھا ادب اور سلیقہ نہیں سکھایا۔ اس نے رسوائی والا کام کر لیا تھا تو تم اس کے جرم پر پردہ ڈال دیتے۔''

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں اور جب کسی حاکم کے سامنے کسی کا جرم ثابت ہو جائے تو وہ شرعی سزا دینے کا پابند ہو جاتا ہے۔''

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بتانے لگے:

''مسلمانوں میں سے جس کا ہاتھ سب سے پہلے کاٹا گیا، وہ ایک انصاری تھا۔ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو غم کے مارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برا حال ہو گیا۔ آپ کا یہ حال دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! آپ کو اس شخص کے لائے جانے پر گرانی محسوس ہو رہی ہے؟''

آپ نے فرمایا:

''مجھے گرانی کیوں نہ ہو جب کہ تم اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار بنے ہوئے ہو، یعنی تمھیں اسے وہیں معاف کر دینا چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند فرماتے ہیں، لیکن میں معاف نہیں کر سکتا، کیونکہ جب حاکم کے پاس کوئی جرم شرعاً ثابت ہو جائے تو ضروری ہے کہ وہ اس جرم کی شرعی سزا نافذ کرے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

''اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔''

O

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور وہ موقع تھا حج یا عمرے کا۔ ان دونوں حضرات نے ایک سوار کو آتے دیکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ کر فرمایا:

''میرا خیال ہے، یہ ہمیں تلاش کر رہا ہے۔''

اتنے میں وہ آدمی ان تک پہنچ گیا۔ آتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

''کیا بات ہے، اگر تمھیں کسی کا قرض دینا ہے تو ہم تمھاری مدد کریں گے، اگر تمھیں کسی کا ڈر ہے تو ہم تمھیں امن دیں گے، لیکن اگر تم نے کسی کو ناحق قتل کیا ہے تو پھر تمھیں اس قتل کا بدلہ دینا ہوگا اور اگر تمھیں کسی قوم کے پڑوس میں رہنا پسند نہیں تو ہم تمھیں وہاں سے کسی اور جگہ لے جائیں گے۔''

اب اس نے بتایا:

''میں قبیلہ بنو تمیم کا آدمی ہوں۔ میں نے شراب پی لی تھی۔ اس پر حضرت موسیٰ رضی اللہ عنہ نے مجھے کوڑے بھی لگوائے اور میرا سر بھی منڈایا، پھر میرا منہ کالا کرا کے لوگوں کے درمیان چکر بھی لگوایا اور لوگوں میں یہ اعلان کر دیا، تم لوگ نہ اس کے پاس بیٹھو گے نہ اس کے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ اس پر میرے دل میں تین باتیں آئیں یا تو میں تلوار لے کر حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دوں یا میں آپ کے پاس آ جاؤں اور آپ مجھے ملک شام میں بھیج دیں، کیونکہ ملک شام والے مجھے جانتے نہیں، اس لیے وہاں رہنا میرے لیے آسان ہوگا یا میں دشمن کے ساتھ جا ملوں اور ان کے ساتھ کھاؤں پیوں۔''

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ پھر اس سے فرمایا:

''تم دشمن سے جا ملو اور مجھے بے انتہا مال مل جائے، تب بھی مجھے اس سے ذرّہ برابر خوشی نہیں ہوگی۔ زمانہ جاہلیت میں میں خود شراب پیتا تھا اور شراب پینا زنا جیسا جرم نہیں۔''

پھر آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھوایا کہ انھیں اس کا منہ کالا کر کے لوگوں میں نہیں پھروانا چاہیے تھا۔ اب لوگوں میں اعلان کراؤ کہ اس کے ساتھ بیٹھا کریں، کھایا کریں اور اگر یہ آیندہ شراب سے توبہ کر لے تو اس کی گواہی قبول کرو۔''

اس کے بعد آپ نے اس شخص کو سواری بھی دی اور دو سو درہم بھی دیے۔ (جاری ہے)

جواہرات سے قیمتی

- دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح ہے۔
- انسان نماز روزے سے نہیں، معمولات سے پہچانا جاتا ہے۔
- جس شخص کی زبان اس پر حکمران ہے، اس کی ہلاکت کا فیصلہ کرتی ہے۔
- تم میں بہتر وہ ہے، جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے۔
- اوپر نگاہیں کر کے چلنا شریروں کی نشانی ہے۔
- مومن کے دروازے پر سائل اللہ کا تحفہ ہے۔
- قناعت آرام کی کنجی ہے۔
- موت کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سویا کرو۔
- علم بہت بڑا پردہ ہے۔
- مردہ جاتا ہے جو کسی کے دل میں زندہ نہ رہا۔
- جو چیز آپ کے پاس سب سے اچھی ہے، اسے اللہ کے راستے میں لگا دیں۔ اس طرح آپ کی زندگی سب سے اچھی ہو جائے گی۔
- رزق صرف یہ نہیں کہ جیب میں مال ہو، بلکہ رزق یہ بھی ہے کہ ذہن میں اچھے خیالات ہوں۔
- اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی چیز یعنی آزمائش کا مخلوق سے گلہ نہ کر۔
- ہمارا ہونا کس کام کا اگر ہمارے نہ ہونے سے کچھ فرق نہ پڑے۔
- نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک کہ اٹھائی نہ جائے۔
- دل کی صفائی چاہتا ہے تو آنکھ جہاں سے بند کر لے، یہی وہ رخنہ ہے، جہاں سے غبار آتا ہے۔
- سنجیدہ رہنے والا ہمیشہ عزت پاتا ہے۔
- ایمان پر موت جنت میں جانے کی سند ہے۔
- جس نے صبر کیا، اس نے سب کچھ پا لیا۔
- بلند مقام خواہشات سے اور آرزوؤں سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ عزم، ارادے، تدبیر اور عمل سے حاصل ہوتا۔

ارسال کرنے والے

واصف علی واصف جلال پور پیروالا۔ ام کلثوم فیصل آباد۔ ام کلثوم خان پور بگا شیر۔
ڈاکٹر میر افضل رتیڑہ تونسہ۔ محمد ابراہیم قاسمی ملتان۔ عائشہ، فائزہ، سائرہ، حاجی خلیل شاہ پور جاکہ۔

7

تصویر کی دھمکی

اشتیاق احمد

انھوں نے دیکھا، کمرے میں انسپکٹر کامران مرزا انھیں بری طرح گھور رہے تھے...

''رات کے ایک بجے کہاں آوارہ گردی کر کے آرہے ہو؟'' انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے ابا جان۔'' آفتاب نے کہا۔

''اوہو تمہارا تو سانس بھی پھولا ہوا ہے، کیا پولیس سے جان بچا کر آرہے ہو۔''

''جی، جی ہاں... بس یہی سمجھ لیجیے۔''

''اچھا، سمجھ لیا... لیکن اس صورت میں ہمیں اس کمرے میں نہیں ٹھہرنا چاہیے... آؤ ساتھ والے کمرے میں چلیں۔'' انھوں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''جی، ساتھ والا کمرہ؟'' آصف نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''میں نے اس ہوٹل میں دو کمرے بک کرائے تھے، لیکن تمھیں ایک ہی کمرہ استعمال کرنے کے لیے کہا تھا... اب ساتھ والا کمرہ میرے پاس ہے۔''

''واہ مزا آگیا... یہ ہوئی نا بات۔'' آفتاب خوش ہو کر بولا۔

''یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ بات ہوئی یا نہیں... پہلے میں تمہاری ایک کہانی سن لوں، آؤ۔''

انھوں نے اپنے کمرے کے دروازے کو تالا لگایا اور پھر سامنے والے کمرے میں چلے آئے... انسپکٹر کامران مرزا نے دروازہ اندر سے بند کر لیا... اور پھر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان کا میک اپ زائل کر دیا... اب دونوں اپنی اصلی صورت میں تھے...

''ہاں، اب بتاؤ، کیا کہانی ہے؟'' انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ابا جان، کیا آپ طنز کر رہے ہیں؟''

''تم کہانی سناؤ... میں نے مناسب جانا تو اپنا طنز واپس لے لوں گا۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

آفتاب نے قصبہ بلو شاہ پہنچنے کے بعد شابو کے میز پر آکر بیٹھنے، پھر گھوش کے آنے سے لے کر سردار ہارون کے گھر سے فرار تک کی کہانی پوری تفصیل سے سنا دی... انسپکٹر کامران مرزا تھوڑی دیر تک تو سوچتے رہے، پھر بولے...

''ان حالات میں اب تم دونوں کو میک اپ میں نہیں رہنا چاہیے... تم تجوری پر اپنی انگلیوں کے نشانات بھی چھوڑ آئے ہو۔''

''جی ہاں، اگر سردار ہارون جاگ نہ جاتے تو ہم نشانات صاف کر کے آتے۔''

''لیکن تمھیں پہلے ہی دستانوں کا بندوبست کر کے جانا چاہیے تھا۔''

''گویا آپ کو ہمارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' آصف نے حیران ہو کر کہا۔

''نہیں، ظاہر ہے، ان حالات میں تم کر ہی کیا سکتے تھے... ہاں وہ شیشی کہاں ہے؟'' انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

''میرے پاس۔'' آصف نے کہا۔

''مجھے دو۔'' وہ بولے... آصف نے شیشی ان کے حوالے کر دی... انھوں نے اس میں موجود مائع کو ایک نظر دیکھا اور بولے:

''یہ کلوروفارم نہیں، ضرور کوئی زہر ہے... بلی کے پوسٹ مارٹم سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سا زہر ہے۔''

''کیا آپ کوئی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ چکر کیا ہے؟''

''ابھی تک نہیں۔'' انھوں نے انکار میں سر ہلایا۔

اسی وقت انھوں نے بھاری بوٹوں کی آواز سنی... آواز آفتاب اور آصف والے کمرے کے دروازے پر آکر رک گئی، پھر انھوں نے انوار صدیقی کی آواز سنی...

''دروازے میں تالا لگا ہوا ہے... اس کا مطلب ہے، وہ ابھی واپس نہیں آئے، لیکن پہنچنے والے ہی ہوں گے... خیر، ہم یہیں ٹھہر کر ان کا انتظار کریں گے۔''

''لیکن سر، اگر وہ یہاں واپس نہ آئے اور کسی اور طرف نکل گئے تو انھیں پکڑنا مشکل ہو جائے گا۔''

''نہیں، وہ ضرور یہیں آئیں گے... میں اُن سے مل چکا ہوں... وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا ہیں... ان کی خود اعتمادی انھیں یہاں ضرور لائے گی اور وہ مارے جائیں گے... میرے تو کان اسی وقت کھڑے ہوئے تھے، جب انھوں نے شابو اور گھوش سے ملاقات کی تھی... میں حیران تھا کہ گھوش ان سے کیوں ملا تھا... اس سے پہلے شابو نے گھوش سے کیا بات کی تھی؟''

ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی، پھر انوار صدیقی نے کسی سے کہا:

''تم لوگ برآمدے ہی میں ادھر اُدھر چھپ کر کھڑے ہو جاؤ... میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔''

''جی بہتر۔''

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، انسپکٹر کامران مرزا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا... ان کے کمرے کا بلب جل رہا تھا... اس عالم میں تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا... پھر اچانک ان کے دروازے پر دستک دی گئی... انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً اپنی جیب سے کوئی چیز نکالی اور اسے اپنے دائیں گال پر چپکا لیا... انھوں نے دیکھا، اب ان کے گال پر ابھرا ہوا تل موجود تھا اور ان کے حلیے میں معمولی سی تبدیلی آگئی تھی، پھر وہ اُٹھے اور دروازے کی طرف چل پڑے... دروازہ کھولتے ہی انھوں نے انوار صدیقی کو دیکھا... انسپکٹر کامران مرزا اور ان دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے اس نے کہا:

''معاف کیجیے گا... آپ کے ساتھ والے کمرے میں دو لڑکے ٹھہرے ہوئے ہیں، اس وقت وہ کمرے میں موجود نہیں ہیں، ہمیں ان سے کچھ سوالات کرنے ہیں... کیا آپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟''

''جی نہیں۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

''گویا آپ نے نہ انھیں جاتے دیکھا نہ آتے۔''

''جی نہیں۔''

''یہ دونوں آپ کے لڑکے ہیں؟'' انوار صدیقی نے آفتاب اور آصف کو گھورتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔''

''نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ انھیں کہیں دیکھا ہے۔'' اس نے الجھن کے عالم میں کہا۔

''آپ دارالحکومت تو جاتے رہتے ہوں گے۔''

''جی ہاں، اکثر جاتا رہتا ہوں۔''

''بس تو پھر، وہیں کہیں انھیں دیکھا ہوگا۔''

''بہت بہت شکریہ، میں نے بلاوجہ آپ کو زحمت دی۔''

''کوئی بات نہیں، لیکن معاملہ کیا ہے؟''

''آپ کے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے دو لڑکوں نے ایک کوٹھی میں چوری کرنے کی کوشش کی ہے... کوٹھی کے مالک کی بلی مردہ پائی گئی ہے... تجوری کی حفاظت کا اس کے مالک نے عجیب و غریب بندوبست کیا ہوا ہے، ورنہ وہ لٹنے سے بچ نہیں سکتا تھا، کیونکہ ان دونوں نے تجوری کو کھول لیا تھا۔''

''لیکن آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ یہ کام ان دونوں کا ہے جو یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''میری ایک اتفاق کے تحت ان سے ملاقات

خط جو واپس آیا

حبیب اللہ مجاہد۔ راولپنڈی

ہوا یوں کہ ہم سے ایک تحریر ''سرزد'' ہوگئی۔ اپنے گمان میں یہ ایک بہترین کہانی تھی۔ ''تحریر'' تو ہم نے کسرِ نفسی سے کہا ہے۔ ہم نے اسے صاف صاف لکھا اور لفافے میں ڈال کر ایک صاحب کے حوالے کیا۔ اس لیے کہ جیل حکام بڑے مہربان ہیں۔ ہم قیدیوں کو اتنی زحمت نہیں دیتے کہ ہم باہر جا کر اپنا خط پوسٹ یا رجسٹری کرا لیں۔ اب جیل کے اندر تو ایک بوسیدہ سا لیٹر بکس کہیں لگا ہے اور بس۔ یہ لیٹر بکس بھی مہینوں بعد کہیں کھلتا ہوگا۔ اس مجبوری کے تحت ہم اپنے خط اکثر ''کسی صاحب'' کے حوالے کرتے ہیں جو باہر سے پوسٹ کرا دے۔ اب یہ ''صاحب'' اگر حقیقی معنوں میں ''صاحب'' ہوں جیسے انگریزوں کے ''صاحب بہادر'' ہوتے تھے تو خط کا اللہ ہی حافظ۔ عموماً کسی قیدی کے رشتہ داروں کو ہی دیا جاتا ہے۔ خیر ہم نے ان صاحب کو تاکید کی کہ یہ خط صرف پوسٹ نہیں رجسٹری کرانا ہے اور اس کے لیے رقم بھی دے دی۔ اس کے بعد چند دن تو ہم تصور میں اپنی کہانی کے ساتھ سفر کرتے رہے جب ہم نے اسے اشتیاق احمد کی میز تک پہنچا دیا اور تصور ہی تصور میں اشتیاق احمد کو کہانی پڑھتے اور واہ جی! کرتے سنا۔ پھر ہم کہانی کو یعنی خط کو بھول ہی گئے۔ بھول جانے کی تاکید بھی تو اشتیاق احمد اکثر کرتے ہیں۔ ہم بھول چکے تھے، لیکن ایک دن یونہی صدا ''آئی ڈاک آئی ہے'' ہم نے وصول کی، حسب معمول خوش بھی تھے کہ جانے کس طرف سے آیا ہے۔ یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوتی ہے۔ لفافے پر نظر پڑی تو میں دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا؟ اشتیاق احمد کے نام کا خط مجھے کیوں ملا؟ اور اس پر یہ سرخ لکیریں کیوں لگی ہیں۔ پلٹ کر دیکھا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ واپسی کا پتا میرے نام تھا، یعنی اس خط نے الٹا سفر کیا جسے ریورس کہتے ہیں؟ لیکن کیوں؟ کیا اشتیاق احمد ہم سے ناراض ہیں؟ کیا وہ خطوط کہانیاں وغیرہ سے اس قدر خود کفیل ہوگئے ہیں کہ اب واپس بھیجنے لگے ہیں؟ اس سے قبل کہ کوئی اور خیال آتا جو برا بھی ہوسکتا تھا، میں نے دوبارہ لفافہ پلٹا، ہو نہ ہو ان سرخ لکیروں میں کوئی راز ہے۔ علمِ ابجد، علمِ ریاضی، علمِ دست شناسی، حتیٰ کہ علمِ جغرافیہ، قسم لے لیں ہم سب سے نابلد ہیں، بلکہ ان سب سے چڑ ہی رہی ہے، پھر معمہ کیوں کر حل ہو۔ لفافہ کھول کر دیکھا تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم نے پیک کیا تھا۔ خیر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کام میں لا کر سرخ لکیروں کو جوڑا تو جملہ سمجھ میں آیا۔ وہ اس سے زیادہ افسوس ناک تھا ''لینے سے انکاری ہیں'' یقیناً یہ ڈاک خانے والوں نے لکھا تھا۔ آخر کیوں؟ سوالات اور خدشات پھر بڑھ گئے، اسی دوران ایک کونے پر لکھے RS. 8/ پر نظر پڑی۔ مزید غور کرنے کے بعد عقدہ یہ کھلا کہ یہ خط رجسٹری تو کیا کرایا ہوتا، اس پر زائد ٹکٹ بھی نہیں لگے تھے۔ ظاہر ہے عام لفافے کو آپ اتنے ہی وزن کے لیے استعمال کر سکتے ہیں جتنے کے لیے اس پر ٹکٹ لگے ہیں۔ اس سے زائد وزن اگر ہو، یعنی خط بھاری ہو تو اگر عام ڈاک سے بھی بھیجنا ہو تو اس پر مزید ٹکٹ لگانا ضروری تھا۔ جب یہ حقیقت کھلی تو اب غصے کے بجائے شرمندگی ہونے لگی۔ اشتیاق احمد کیا سوچیں گے؟ آٹھ روپے کے ٹکٹ کیا وہ اپنی جیب سے دیتے؟ کیوں؟ اور پھر روزانہ کی ڈاک میں اگر ایسے کئی خطوط زاید رقم والے ہوں تو؟ بس! یہی باتیں سوچ کر شرمندگی ہوئی اور یہ احساس بڑھ گیا کہ انھیں یہ خط واپس کرتے ہوئے یقیناً دکھ بھی ہوتا ہوگا اور کسی انسان کو دکھ دینا؟ وہ بھی ایک شریف مسلمان کو؟

ہم نے اس کے بعد پہلی فرصت میں ایک وضاحتی خط اشتیاق احمد کے نام لکھا اور ایک بااعتماد ذریعے سے کہانی سمیت دوبارہ رجسٹری کر دیا۔ اس بار ہم رجسٹری کرانے والے سے ''رسید'' لینا نہیں بھولے تھے۔ یہاں تک بات اس لحاظ سے ٹھیک تھی کہ ہم نے جو کچھ کیا، وہ ہم پر لازم تھا، لیکن اصل حیرت اور خوشی تب ہوئی جب چند دنوں بعد پھر ڈاک کی صدا لگی اور اشتیاق احمد کا خط ملا۔ انھوں نے وضاحت کی ''خط میں نے واپس نہیں کیا یہ ڈاک خانے والوں کا کام ہے'' اس پر نہ صرف ہم مطمئن ہوئے، بلکہ اس واقعے سے ہم نے کئی سبق حاصل کیے۔ پہلا سبق اپنے لیے تھا کہ جیل سے خط بھیجتے وقت بااعتماد آدمی کے ہاتھوں بھجوایا جائے۔ دوسرا سبق ہم سب قارئین اور لکھنے والوں کے لیے تھا کہ ہمارا یہ گلہ کہ اشتیاق احمد نے کہانی یا خط کا کیا کیا؟ ایک طرح سے ہم انھیں الزام دے رہے ہوتے ہیں جب کہ اصل قصور اس میں ہمارا اپنا یا پھر ڈاک خانے والوں کا ہوتا ہے، ورنہ اشتیاق احمد کا میرے نام خط لکھنا کوئی ضروری تو نہ تھا۔ اس میں نہ ان کی غلطی تھی، نہ وہ قصوروار تھے، اس سے ظاہر ہوا کہ اشتیاق احمد خط لکھنے والے قارئین کا پوری طرح احساس رکھتے ہیں۔ اس سب کچھ کے بعد ہم نے دو باتیں میں اشتیاق احمد کی ''راز کی بات'' پلے باندھ لی ہے یہ کہ آئندہ ہم ہر خط کے ساتھ ایک خالی لفافہ ضرور رکھیں گے، کیوں کہ اس طرح ہر لکھنے والا اگر زائد لفافہ بھیجے گا تو مدیر کو ضرورت ہوئی تو واپسی جواب میں لفافے کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ اگر زاید ٹکٹ کی ضرورت ہو تو وہ بھی اس زاید لفافے سے پوری ہوگی۔

کیا خیال ہے قارئین اور لکھنے والے حضرات! آج سے سب اسی پر عمل کریں گے نا! اسیر کی یہی صدا ہے!

ہوئی تھی ... ادھر کوٹھی کے مالک نے بھی بالکل وہی حلیہ بتایا ہے جو ان دونوں کا ہے، لہٰذا میں سیدھا یہیں آسکتا تھا۔''

''ہوں ٹھیک ہے ... مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کسی کام نہیں آسکا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے انوار صدیقی مڑ گیا اور انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔

آدھ گھنٹے بعد انوار صدیقی اپنے ماتحتوں کے ساتھ واپس جا رہا تھا، البتہ اس نے ایک کانسٹیبل کو برآمدے میں چھوڑ دیا تھا، تاکہ جوں ہی وہ دونوں آئیں ... کانسٹیبل انوار صدیقی کو فون کر دے ...

''کیوں بھئی، تم نے شابو کو غور سے دیکھا تھا۔''

انسپکٹر کامران مرزا نے دبی آواز میں پوچھا۔

''جی ہاں، کیوں کیا بات ہے؟''

''اگر وہ بدلے ہوئے حلیے میں تمہارے سامنے آئے تو کیا اس صورت میں بھی پہچان لو گے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جی، اس صورت میں بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''جس طرح اب تم پہلے حلیے میں نہیں رہے ... اسی طرح اب وہ اپنے پہلے حلیے میں نظر نہیں آئے گا۔''

''تو کیا وہ بھی میک اپ میں تھا۔'' آصف نے جلدی سے پوچھا۔

''بالکل، بھلا اس میں کیا شک ہے؟'' انھوں نے کہا۔

''اوہ۔'' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ... ان کے چہرے پر حیرت کے آثار طاری ہوگئے ... اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ شابو کو کھو چکے ہیں ... اب یہ معلوم کرنا آسان کام نہیں رہا تھا کہ شابو سردار ہارون کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا تھا ... (جاری ہے)

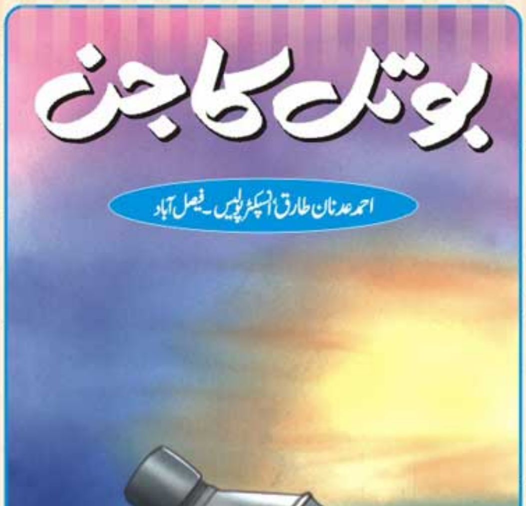

پانی پر تیرتی بوتل کو دیکھ کر شوال چونک اٹھا۔ اس کے اندر ایک آواز ابھری:

"ہو نہ ہو، اس بوتل میں ضرور کوئی جن ہے۔"

وہ سیر کرتا آج دور نکل آیا تھا... یہاں تک کہ دریا کے کنارے آ پہنچا تھا... یہیں اسے وہ بوتل نظر آئی... اس نے دیکھا، بوتل سیدھی اس کی طرف آ رہی تھی... گویا ہوا کا رخ اس کی طرف تھا... اور پھر بوتل اس کے پاؤں سے آ لگی... اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اسے اٹھا لیا... یہ دیکھ کر اس کی حیرت اور بھی بڑھی کہ وہ کوئی پلاسٹک کی یا شیشے کی بوتل نہیں تھی... بلکہ وہ تو کسی دھات کی تھی... ہلکی سی دھات کی جیسے ایلومینیم کی ہوتی ہے، اس کے اوپر ڈھکنا نہیں، بلکہ کارک لگا ہوا تھا اور کارک کو بہت مضبوطی سے بوتل کے منہ پر فٹ کیا گیا تھا...

وہ جادوئی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوقین تھا... ان کہانیوں میں اسے ان جنوں کی کہانیاں بہت بھاتی تھیں... جو کسی بوتل یا کسی چراغ میں قید ہوتے تھے اور کسی کے ذریعے رہائی ملنے پر کہتے تھے:

"کیا حکم ہے میرے آقا۔"

اس وقت بھی اسے اسی قسم کے خیالات آ رہے تھے... اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کارک کو نکالنے کے لیے گھمایا... کارک گھمانے کے لیے اسے بہت زور لگانا پڑا... آخر کار کارک بوتل کے منہ سے نکل آیا... فوراً ایک ہلکا سا دھماکا ہوا... جیسے بہت ساری گیس اس بوتل میں قید تھی اور کارک نکلتے ہی باہر نکل گئی ہو...

ہلکے دھماکے کی آواز سن کر اس کا منہ بن گیا... کیونکہ کسی نے بھی نہیں کہا تھا:

"کیا حکم ہے میرے آقا۔"

پھر اس نے ہنسی کی آواز سنی... وہ ایسی تھی جیسے بادل گرج رہے ہوں... اس نے ادھر اُدھر آگے پیچھے دیکھا... تو پیچھے کی طرف ایک ستون سا کھڑا نظر آیا، پھر اس ستون میں سے آواز آئی:

"آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے... میں مدتوں سے اس بوتل میں بند تھا... ایک ظالم جادوگر نے مجھے اس بوتل میں قید کر دیا تھا..."

"لل... لیکن کیوں؟" اس کے منہ سے ڈرے ڈرے انداز میں نکلا۔

"اس نے مجھے ایک ایسا حکم دیا تھا... جو میں پورا نہ کر سکا... بس اسے غصہ آ گیا اور اس نے مجھے جادو کے زور سے بوتل میں بند کر دیا۔"

"تت... تت تو آپ... وا... واقعی جن میاں ہیں۔"

"ہاں! میں ایک جن ہوں... اور اب اپنی جنوں کی بستی میں جانا چاہتا ہوں... اجازت ہے۔"

"تو آپ میری کوئی خواہش میرا کوئی حکم پورا نہیں کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا آپ نے الہ دین کے چراغ کی کہانی نہیں پڑھی... بوتل کے جن والی کہانی بھی نہیں پڑھی... میں نے آپ کو بوتل سے نکالا ہے تو میرے بھی تو کام آیئے نا۔"

"اوہ اچھا... یہ بات ہے... چلو ٹھیک ہے... بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"اوہو... تو یوں کہو نا... کیا حکم ہے میرے آقا۔"

"نہیں بچے... تم میرے آقا نہیں ہو... ہاں تم نے مجھ پر احسان ضرور کیا ہے... اور اس احسان کے بدلے میں میں تمہارا کوئی ایک کام ضرور کروں گا... بتاؤ... تم کیا چاہتے ہو۔"

شوال سوچ میں پڑ گیا... کہ اسے کیا کام بتائے... یہ تو اس کام کو کرتے ہی رفو چکر ہو جائے گا... اور پھر میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا...

آخر اس نے خوب سوچ کر کہا:

"تم وعدہ کرتے ہو! میری ایک خواہش ضرور پوری کرو گے۔"

"ہاں! میں شاہِ جنات کی قسم کھا کر کہتا ہوں... تمہاری ایک خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

"اچھا تو پھر میری خواہش ہے کہ تم ہر گھنٹے بعد مجھ سے آ کر پوچھو گے... کیا حکم ہے میرے آقا۔"

"کیا!!!" جن چلا اٹھا۔ پھر اس نے کہا:

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"تم وعدہ کر چکے ہو۔"

"اچھی بات ہے... میں ہر گھنٹے بعد آؤں گا... تم ہر مرتبہ مجھے ایک خواہش بتاؤ گے... لیکن یاد رکھنا جس وقت تم نے خواہش نہ بتائی، میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا... سمجھے تم!"

"ہاں! میں سمجھ گیا۔"

"تو پھر آج کی خواہش بتاؤ۔"

"مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ اس کے بعد میرے گھر میں مٹھائیوں اور پھلوں کے ڈھیر لگا دو۔"

"بہت اچھا۔"

جن نے اسے اپنے ایک ہاتھ پر کھڑا کیا اور پلک جھپکتے میں اسے اس کے گھر پہنچا دیا... ساتھ ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا... جلد ہی وہ پھلوں اور مٹھائیوں کی پیٹیوں اور ٹوکریوں کے ساتھ آ موجود ہوا:

شوال کے گھر والے حیرت زدہ رہ گئے... پھر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے... شوال بھی ان کے ساتھ خوش ہو کر پھل اور مٹھائیاں کھانے لگا... اسے پتا بھی نہ چلا اور ایک گھنٹا گزر گیا... فوراً ہی جن آ دھمکا... اس نے کہا:

"شوال! اپنی اگلی خواہش بتاؤ۔"

اس نے فوراً ہی کہہ دیا:

"ہم سب کے لیے ریڈی میڈ کپڑے لے آؤ... بہت اچھے اچھے خوب صورت کپڑے... جن کو پہن کر ہم سب خوش ہو جائیں۔"

"بہت اچھا! جن نے کہا اور غائب ہو گیا... جلد ہی ان کے گھروں میں ریڈی میڈ کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا... وہ ان سب کپڑوں کو پہن پہن کر دیکھنے لگے... انھیں پتا بھی نہ چلا اور ایک گھنٹا گزر گیا... جن پھر

آخر میں

شازیہ نور-لاہور

میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر مجھے جانا کہاں ہے۔ میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ رات کا اندھیرا بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے خوف میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، چلتے چلتے میں ایک گلی میں مڑ گیا، کیا دیکھتا ہوں، وہاں کتے ہی کتے ہیں، مجھے دیکھتے ہی کتے بھونکنا شروع ہو گئے۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور ایک دوسری گلی میں مڑ گیا مگر اس گلی میں بے شمار پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ نوک دار پتھروں پر میرا چلنا دوبھر ہو رہا تھا اور پھر میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔

اسی لمحے میرے موبائل میں لگا خاص الارم بولنے لگا ''الصلوۃ خیر من النوم'' میں جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

''اوہ!'' میں تو خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اٹھ کر نمازِ فجر کی تیاری کرنے لگا، لیکن خواب کا اثر مسلسل مجھے اپنے دل پر محسوس ہو رہا تھا۔ اسی خواب سے ملتے جلتے خواب مجھے آئے دن نظر آتے رہتے تھے اور میں ان کی وجہ سے الجھن کا شکار رہتا تھا۔ ہر روز مسجد میں نماز ادا کر کے میں حسبِ عادت قریبی باغ میں نکل جاتا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ سبحان اللہ، الحمدللہ اور اللہ اکبر پڑھتا جاتا تھا۔ بیس منٹ تک چہل قدمی کے بعد جب میں گھر واپس پہنچتا تو اچھی خاصی روشنی پھیل چکی ہوتی تھی۔ میں چند منٹ لیٹ جاتا اور آنکھیں بند کر تصور کرتے تاکہ میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ ایسا کرنے سے میری ساری تھکن اتر جاتی تھی اور میں اٹھ کر غسل خانے چلا جاتا۔ نہا دھو کر جب باہر نکلتا تو میرا ناشتا تیار ہوتا۔ میری امی جان میرے لیے ناشتا بنا کر میرے کمرے میں ہی رکھ جاتی تھیں۔ میں ناشتا کر کے اپنی فیکٹری جانے کے لیے تیاری مکمل کرتا اور پھر امی جان کو سلام کر کے اور اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر گھر سے نکل آتا، کیونکہ مجھے اسے اس کے سکول چھوڑنا ہوتا تھا، فیکٹری دور ہونے کی وجہ سے میں بھی جلدی نکلتا تھا اور ہمیشہ وقت سے پہلے ہی فیکٹری پہنچ جاتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ فیکٹری میں میری ملازمت فورمین کی تھی۔ تمام کام کرنے والوں کی نگرانی، انھیں صحیح کام کرنے کی ترغیب دینا، ان سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے ساتھ ساتھ لین دین کے معاملات بھی میرے ہاتھ میں تھے۔ فیکٹری کے مالک کا حکم تھا کہ میں تمام کام کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آؤں، اسی لیے فیکٹری میں میرا رویہ تمام ورکرز کے ساتھ انتہائی دُرشت تھا۔ گرمی کے دنوں میں فیکٹری مزید گرم ہو جاتی تھی اور اس کا اثر مزاج پر ہوتا تھا اور جب اس میں تھکن بھی شامل ہو جاتی تو میں چڑچڑا ہو جاتا اور پھر جو میرے سامنے آتا، میں اسے بہت گندی گالیوں سے نوازتا، یہی وجہ تھی کہ فیکٹری ورکرز مجھ سے بہت ڈرتے تھے۔

گالیاں دینے کی یہ عادت کچھ اتنی پختہ ہوتی جا رہی تھی کہ میں فیکٹری سے باہر بھی کسی پر برہم ہوتا تو گالیاں میرے منہ سے خود بخود نکل جاتیں۔ میری اس بری عادت کی وجہ سے میرے گھر والے بھی پریشان تھے۔ امی مجھے منع کرتیں تو میں انھیں یہ کہہ کر چپ کرا دیتا کہ اگر میں ایسی زبان استعمال نہ کروں تو لوگ کام ہی (باقی صفحہ 15 پر)

آ موجود ہوا... اس نے کہا:

''اگلا حکم بتائیں۔''

شوال نے فوراً ہی کہہ دیا:

''بہترین کھانے لے آؤ... مدت ہوگئی ہم نے گوشت والی چیزیں نہیں کھائیں... یعنی تکے... ڈرم سٹک وغیرہ۔''

''بہت اچھا۔''

جلد ہی کھانے کی بے شمار چیزیں ان کے گھر میں موجود تھیں اور وہ ان سے انصاف کر رہے تھے... لیکن پھر ایک گھنٹا گزرتے ہی جن پھر آ گیا...

''اب کیا حکم ہے؟''

شوال نے جلدی جلدی سوچا... پھر اس نے گھبرا کر کہا:

''بہت ساری دولت چاہیے... اس میں سونے چاندی کے زیورات بھی ہوں... نقد رقم بھی ہو۔''

''بہت اچھا!'' جن نے کہا اور غائب ہو گیا۔

اب ان کے گھر میں دولت کا ڈھیر لگ گیا... وہ سونے چاندی کے زیورات اور نوٹوں کو اچھال اچھال کر خوش ہونے لگے... خوش ہوتے انھیں پتا بھی نہ چلا اور ایک گھنٹا گزر گیا... جن پھر آ موجود ہوا:

''اب کیا حکم ہے۔''

شوال پریشان ہو گیا کہ اب اسے کیا بتائے... آخر سوچ سوچ کر اس نے کہا:

''ہمارے لیے ایک خوب صورت سی... بڑی سی کار لے آؤ۔''

''جی اچھا!'' جن نے کہا اور چلا گیا۔

اس وقت شوال پر گھبراہٹ طاری ہوئی... اس نے سوچا... کار لانے کے بعد یہ پھر آ کر کہے گا... کیا حکم ہے... آخر میں اسے کیا کیا بتاؤں گا... اور نہ بتا سکا تو یہ تو مروڑ دے گا میری گردن... اب کیا کروں... اسے کیا بتاؤں... جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اسے اپنے والد کی بات یاد آ گئی... ان کا کہنا تھا:

''کاموں میں بڑوں سے مشورہ لینا چاہیے... بڑوں کی بات بڑی ہوتی ہے۔''

یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے والد سے کہا:

''ابا جان... جن پھر آنے والا ہے... اس سے پہلے ہی کوئی ایسا کام بتا دیں... جو میں جن سے کہوں... اور وہ نہ کر سکے... جب وہ بتایا ہوا کام نہیں کر سکے گا... تو اس سے جان چھوٹ جائے گی۔''

''اوہ اچھا!'' اس کے والد نے کہا... پھر وہ سوچ میں ڈوب گئے...

عین اس لمحے جن آ گیا... اس نے آتے ہی کہا:

''اب کیا حکم ہے؟''

''ٹھہرو... ہم سوچ رہے ہیں۔''

''جلدی سوچ لیں... ایک گھنٹا گزرنے میں بس ایک دو منٹ ہیں... تم کام نہ بتا سکے تو میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا... اور آزاد ہو جاؤں گا۔''

''ابا جان! جلدی۔'' شوال نے گھبرا کر کہا۔

''میں سوچ رہا ہوں... سوچ رہا ہوں۔'' اس کے والد کی آواز ابھری۔

''وقت ختم ہو رہا ہے... میاں شوال... میں تمہاری گردن مروڑ رہا ہوں اور اس وقت بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی جن نے شوال کی گردن پکڑ لی... اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

''نن... نہیں۔''

''بیٹا... جو کام تمہارے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے، وہ اس سے کہہ دو... یہ کہ جاؤ نماز پڑھتے رہو۔''

''اوہ!'' شوال چونکا۔ پھر اس نے جن سے کہا:

''جاؤ نماز پڑھتے رہو۔''

جن ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ آیا... البتہ پولیس ان کے دروازے پر ضرور آئی... پولیس انسپکٹر کا کہنا تھا کہ اس گھر میں چوری کا مال ہے... اور یہ بات غلط نہیں تھی... جن نے بھی تو آخر ادھر اُدھر سے مال سمیٹ کر ان کے گھر پہنچایا تھا... شوال کے والد نے ساری بات انسپکٹر صاحب کو بتائی۔ تمام کپڑے، کار اور زیورات وغیرہ واپس کر دیے...

شوال اب ایسی باتیں نہیں سوچتا تھا... بلکہ اب تو وہ نماز کی طرف متوجہ ہو گیا ہے...

پھول

اعظم طارق کوہستانی۔ کراچی

جونز کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات رفتہ رفتہ گہرے ہوتے جارہے تھے۔ اس کی نظریں سامنے میز پر جمی ہوئی تھیں۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ ایک دفتر ہے۔ کمرے میں موجود جونز کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ عام پولیس والوں سے مختلف ہے۔ وہ اپنے محکمے کا سب سے ذہین پولیس انسپکٹر مانا جاتا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال، چمکتی آنکھیں اور مسکراتا چہرہ اسے کہیں سے پولیس والا ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اس وقت دفتر میں رسائل اور اخبارات ایک طرف بکھرے پڑے تھے۔ اخبارات و رسائل کا دفتر میں ہونا یہ ثابت کرتا تھا کہ جونز کو پڑھنے کا خاص شغف ہے مگر اس وقت اسے یہ رسائل بہت برے لگ رہے تھے۔ اس نے اپنی نظریں ابھی تک میز پر جمائی ہوئی تھیں۔ اچانک دروازہ کھلا اور جونز کا ماتحت مائیکل آدھمکا۔ آپس میں بے تکلفی نے اجازت لینے کے معاملات ختم کردیے تھے۔

''خیریت سر! آج موڈ آف لگ رہا ہے، بیگم سے جھگڑا ہوا کیا!'' مائیکل سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیوں صرف اس وجہ سے لوگوں کا موڈ آف ہوتا ہے؟'' جونز نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''نہیں! ہیں! تو کئی ہوسکتی ہے مگر آپ کو ہمیشہ کسی پیچیدہ کیس کے سلسلے میں ہی اتنا بے چین دیکھا ہے۔'' مائیکل سنجیدہ ہوگیا۔

جونز ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے بولا: ''چلو مائیکل! جلدی سے گاڑی نکالو، ہمیں پرنس ڈیوڈ کے گھر جانا ہے۔''

''اوہ! میں سمجھ گیا۔ آپ محمد طیب کے قتل پر کام کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ تمہاری ناتجربہ کاری اور غلط فہمی ہے مسٹر مائیکل ... محمد طیب کا قتل جنوبی افریقہ میں ہوا ہے اور جنوبی افریقہ لندن پولیس کی حدود میں نہیں آتا۔''

جونز کا لہجہ غصیلا تھا۔ مائیکل جنوبی افریقہ کا نام سن کر صرف منہ بنا سکا۔

☆

پرنس ڈیوڈ لندن کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مالک تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت لندن کے امیر کبیر گھرانوں کی طرف سے دی گئی ''پارٹیوں'' میں صرف ہوتا تھا۔ وہ گھر میں کم ہی ہوتا تھا، لیکن جب گھر میں ہوتا تو اس وقت کسی سے ملنے کی زحمت نہ کرتا۔

ڈیوڈ کا اصل کاروبار کیا تھا؟ جونز اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہیروں کی اسمگلنگ کا یہ مہنگا شوق صرف ڈیوڈ جیسے لوگ ہی اپنا سکتے تھے جو اوپر تک قانون کے رکھوالوں کی جیبیں گرم رکھ سکیں۔ جونز اور ڈیوڈ ایک دوسرے کو قطعاً ناپسند کرتے تھے۔ جونز بکنے والا اور ڈیوڈ پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔

''جاؤ اپنے مالک سے کہو! مسٹر جونز آئے ہیں۔'' مائیکل دروازہ پر گن لٹکائے ایک حبشی سے مخاطب ہوا۔

''صاحب گھر پر نہیں۔'' حبشی نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

''وہی پرانا بہانہ۔'' جونز بڑبڑایا۔

''بیٹا ہم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، تم ہماری آنکھوں میں جھونک رہے ہو۔'' مائیکل باز نہیں آیا۔

''میں نے کہہ دیا نا ایک دفعہ! کسی اور طریقے سے سمجھاؤں کیا۔'' حبشی نے اپنی ہاف آستین میں پھڑکتی ہوئی مچھلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایسے نہیں سمجھے گا ... جاؤ اپنے باس سے کہو ... سیگال بینک میں لاکر نمبر 5 آدھے گھنٹے میں پریس کے کیمروں کے سامنے ہوگا۔'' جونز نے کہا۔

''اور ہاں سنو ... اگر تمہارے باس کو پتا چلا کہ ہم اسے اس مصیبت سے بچانے آئے تھے اور تم نے ملنے نہیں دیا تو وہ تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔'' مائیکل نے جونز کے نفسیاتی وار میں مزید مبالغہ آرائی کی۔

حبشی پہلے تو انھیں گھور کر دیکھتا رہا ... پھر سر جھٹک کر اندر چلا گیا ... تھوڑی دیر بعد ہی وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور جلدی سے دروازہ کھول کر انھیں اندر جانے کا اشارہ کیا ... اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے سخت قسم کی ڈانٹ پڑی ہے ... مائیکل نے گاڑی کو پورچ میں کھڑی کرنے کے لیے اندر کی جانب موڑ دی ...

''کافی بڑا بنگلہ ہے اور وہ دیکھو کتنے سارے خوب صورت پھول ہیں۔'' مائیکل نے بائیں جانب گاڑی کو آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

جونز کی نظریں پھولوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ ''واقعی لاجواب پھول ہیں۔''

''میں نے سنا ہے پرنس ڈیوڈ پھولوں کا عاشق ہے۔''

''واقعی تم نے ٹھیک کہا۔ وہ پھولوں سے انتہائی محبت کرتا ہے، لیکن کبھی کبھی۔''

''لیکن کبھی کبھی ... کیا سر! آپ خاموش کیوں ہوگئے ...'' مائیکل نے کہا تو جونز نے آگے کی جانب اشارہ کیا ... پرنس ڈیوڈ ان کی گاڑی کی طرف آرہا تھا ... وہ دونوں بھی گاڑی سے اُتر آئے ...

''میرے خیال میں لان میں چلتے ہیں۔'' پرنس ڈیوڈ نے لان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں وہ لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''تم سیگال بینک کے اس لاکر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ اور مجھے دھمکی دینے کی کیوں کوشش کر رہے ہو۔''

''جب ہم بینک کے اس لاکر کے بارے میں جانتے ہیں تو یقیناً یہ بھی جانتے ہیں کہ اس میں کیا چیز موجود ہے۔''

''اس میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہارے کام کا نہیں۔'' پرنس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔

''لیکن وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے لیے کافی کارآمد ہے اور خصوصاً عوام بھی تمہاری اصلیت پہچان لیں گے۔''

''مجھے معلوم ہے، محمد طیب تمہارا کافی اچھا دوست تھا اور تمہیں اس کے مرنے کا کافی افسوس ہے، لیکن! جونز! وہ میرا بھی دوست تھا۔''

''پیسہ بہت بری شے ہے ڈیوڈ۔'' جونز اسے باتوں میں الجھانا چاہتا تھا۔

''تم چاہتے کیا ہو جونز؟'' ڈیوڈ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم نے محمد طیب کے ساتھ مل کر جنوبی افریقہ میں سونے کی ایک کان خریدی ... اس کان سے سونا تو نہیں نکلا ... مگر محمد طیب کی ذہانت نے وہاں سے ہیروں کی ایک بڑی مقدار برآمد کرلی ... وہ ہیرے کافی قیمتی تھے اور تم محمد طیب کو اس میں سے حصہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور پھر جنوبی افریقہ کے جس ہوٹل میں محمد طیب رہتا تھا، وہاں سے اس کی تشدد زدہ لاش ملی۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں۔''

''تم یہ بتانا چاہتے ہو کہ محمد طیب کو میں نے قتل کیا۔'' ڈیوڈ نے خود کو پرسکون رکھنے کی ناممکن کوشش کی۔ اس کے ہاتھ بات کرتے ہوئے کپکپانے لگے۔

''میں نے تو یہ نہیں کہا۔ تم یہ کام کسی اور سے بھی کروا سکتے تھے مگر مجھے لگتا ہے تم جیسا زیرک اور محتاط شخص کسی کو اپنا ہمراز بنانے کی غلطی نہیں کرے گا۔ بینک لاکر میں

موجود کاغذات سے ثابت ہوتا ہے کہ کان کی ملکیت تمہاری اور محمد طیب کی ہے۔“

”ہاہاہا... تمہارے پاس اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ میں ان 10 دنوں میں برطانیہ سے باہر کہیں نہیں گیا ہوں اور میں نے تو جنوبی افریقہ دیکھا ہی نہیں ہے۔ چاہو تو میرا پاسپورٹ دیکھ سکتے ہو۔“ پرنس نے جونز کا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا۔ جونز اور مائیکل خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

”میرا خیال ہے تمھیں میرے قیمتی وقت کا احساس کرنا چاہیے؟“ پرنس مسکرایا۔

”یقیناً آپ کا وقت بے حد قیمتی ہے مگر محمد طیب ایک بہت اچھا انسان تھا، میری نظر میں وہ ایک مسلمان بھی تھا... جو دنیا کے سب سے اچھے مذہب کو مانتے ہیں... وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے اپنی جان دے سکتے ہیں... مگر...“ جونز ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر دوبارہ گویا ہوا۔ ”مگر دنیا کی دولت ان کے نزدیک خاک جتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی اور محمد طیب ایک باعمل مسلمان تھا۔“

پرنس ڈیوڈ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ جونز اور مائیکل گاڑی کی طرف بڑھے۔ پھولوں کی کیاری سے گزرتے ہوئے مائیکل اچانک ایک پھول کی جانب لپکا۔

”پرنس... یہ پھول بہت خوب صورت ہے۔ پہلی بار دیکھا ہے۔ کہاں سے ملا۔“

پرنس نے پھول کی طرف دیکھا... ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا... پھر کہنے لگا:

”یہ میکسیکو سے میرے دوست شیفرڈ نے بھیجا ہے۔“

”اوہ! ویسے پھول کمال کا ہے۔“ مائیکل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

☆

دفتر پہنچتے ہی جونز کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ مائیکل راستے میں ”ایڈیسن لائبریری“ کے قریب اتر گیا تھا۔ تقریباً 2 گھنٹے بعد مائیکل تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ دفتر میں داخل ہوا۔

”سر! آپ کے لیے اتنی بڑی خبر لایا ہوں کہ آپ حیرت سے اچھل پڑیں گے۔“ مائیکل نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

”خیریت... تمہارا چہرہ کچھ زیادہ تمتما رہا ہے۔ کوئی لاٹری نکل آئی کیا۔“

”سر! پرنس کے گھر سے نکلتے ہوئے میں نے ایک پھول کے بارے میں پوچھا تھا۔“

”ہاں... ہاں... وہ گوبھی کے پھول جتنا خوب صورت سا پھول... کیوں؟ کیا ہوا؟ وہ پھول چوری کا ہے۔“

”نو سر! وہ پھول میکسیکو کا نہیں بلکہ دنیا کے صرف ایک شہر میں پایا جاتا ہے اور سر! حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر وہ پھول کسی اور جگہ لگانے کی کوشش کی جائے تو صرف ایک ماہ تک وہ تر و تازہ رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھول مرجھا جاتا ہے۔“

”تو اس میں بڑی خبر کیا ہے۔“ جونز سچ مچ چڑ گیا۔ اسے مائیکل پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مائیکل اس کے خیالات کا رخ بدلنا چاہتا ہے۔

”سر وہ پھول صرف افریقہ کے شہر ”پرے ٹوریا“ میں پایا جاتا ہے۔“

”کیا!“ جونز نے ایک دم اپنی ساری توجہ مائیکل کی جانب کر دی۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔

”اور سر! اس نے خود یہ بات کہی کہ وہ پھول اسے میکسیکو سے شیفرڈ نے بھیجا ہے... آپ نے غور کیا ہوگا کہ وہ جواب دیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا بھی تھا۔“

”ہاں... یہ ساری باتیں اس کے خلاف جاتی ہیں... تم کل اس کے گھر جا کر اس پھول کی خفیہ تصویریں کچھ ایسے کھینچو کہ پرنس کا گھر بھی صاف طور پر نظر آئے... وہ اس بات سے مکر بھی سکتا ہے کہ یہ تصویر اس کے گھر میں لگے پھول کی ہے۔“

”لیکن سر! تصویر کھینچنے کا کیا فائدہ؟“ مائیکل نے چونک کر کہا۔

”اگر تمھیں فائدے کا خود ہی اندازہ ہو جاتا تو میری جگہ تم یہاں بیٹھے ہوتے... تم نے ہی کہا تھا کہ وہ پھول ایک ماہ بعد مرجھا جائے گا... اب ایک ماہ بعد اس پھول کی اس وقت تصویر کھینچنے کی کوشش کریں گے جب وہ مرجھا گیا ہو۔“

”سر! آپ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔“

”اور اگر پھول مرجھا جاتا ہے تو دال میں واقعی کچھ کالا ہوگا۔ جب تک ہم محمد طیب کے گھر والوں کے ذریعے پرنس ڈیوڈ پر مقدمہ درج کروا لیتے ہیں۔“

☆

ڈیڑھ ماہ بعد کمرۂ عدالت بھی ہوئی تھی۔ کمرۂ عدالت میں لوگ ہی لوگ موجود تھے۔ پرنس ڈیوڈ کٹہرے میں کھڑا تھا۔ محمد طیب کے بھائی کے وکیل نے اپنے دلائل دیتے ہوئے کہا: ”می لارڈ! محمد طیب اور پرنس ڈیوڈ اچھے دوست تھے اور انھوں نے مل کر جنوبی افریقہ میں سونے کی ایک کان خریدی۔ کروڑوں ڈالروں میں خریدی گئی یہ کان سونے کے علاوہ قیمتی پتھروں سے بھری ہوئی تھی۔ محمد طیب نے اس کان سے ہیرے نکالے جن کی مالیت کروڑوں ڈالر کی تھی۔

ہیروں کے معروف اسمگلر پرنس ڈیوڈ شیگل کو ہیروں کے لالچ نے اتنا اندھا کر دیا کہ وہ اپنا بھیس بدل کر ایک نئے نام اور پاسپورٹ کے ساتھ جنوبی افریقہ گیا۔ “شیگل کا نام سن کر عدالت میں موجود لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور آپس میں چہ مگوئیاں شروع کر دیں۔ محمد طیب کے وکیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ”وہاں انھوں نے محمد طیب کو انتہائی تشدد کا نشانہ بنا کر ان سے ہیرے حاصل کیے اور واپس لندن آ گئے۔ ہیرے وہ پہلے ہی سوئٹزرلینڈ کے بینک میں جمع کرا چکے تھے۔ پرنس ڈیوڈ کے ساتھ بدقسمتی یہ رہی کہ وہ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسا پھول ”پرے ٹوریا“ سے لایا جو صرف جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ پھول کسی دوسری جگہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کھلا رہتا ہے، پھر ہمیشہ کے لیے مرجھا جاتا ہے۔ پرنس ڈیوڈ نے یہ پھول اپنے پیراڈائز سوسائٹی والے بنگلے میں لگایا۔ یہ پھول پورے 28 دن بعد مرجھا گیا۔ اس کی تصاویر آپ دیکھ سکتے ہیں۔“ وکیل نے جج کی ٹیبل پر چند تصاویر رکھ دیں۔

”پرنس ڈیوڈ کے لندن صدر کے ایک فلیٹ سے نقلی مونچھیں، ڈاڑھی اور میک اپ کے کچھ اور سامان کے علاوہ پاسپورٹ جس پر جنوبی افریقہ کا ویزہ لگا ہوا ہے... پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیے ہیں... چارلس کے نام سے یہ ساری کارروائیاں انجام دینے والے پرنس ڈیوڈ کا میک اپ برطانیہ کے ایک ٹی وی چینل کی میک اپ آرٹسٹ تانی نے کیا تھا۔ عدالت تانی کو گواہی دینے کی اجازت دے۔“

”اجازت دی جاتی ہے۔“ جج نے کہا۔ کمرۂ عدالت میں لوگ پرنس ڈیوڈ کی مکارانہ سازش کو بے نقاب ہوتا دیکھ کر حیرت سے منہ میں انگلیاں دبائے بیٹھے تھے۔ میک اپ آرٹسٹ تانی کی گواہی اور پولیس کی تصدیق نے پرنس ڈیوڈ کے وکیل کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ پرنس ڈیوڈ کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

عدالت نے فیصلہ سناتے ہوئے پرنس ڈیوڈ کو عمر قید کی سزا سنائی اور اس کی تمام جائیداد محمد طیب کے وارثوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ سنا کر عدالت برخاست کر دی۔ عدالت کا فیصلہ سن کر جونز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”سر! ہم جیت گئے۔ سر! ہم نے محمد طیب کے خون کا بدلہ لے لیا۔“

”ہاں... مائیکل... ہم جیت گئے... محمد طیب ایک عظیم انسان تھے... جب میں لندن میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا تو انھوں نے 5 سال تک مجھے اپنے گھر میں بھائیوں کی طرح رکھا... اور مجھے اس مقام تک پہنچایا۔“

سر! تبھی آپ مسلمانوں کو اتنا اچھا سمجھتے ہیں۔“

”ہاں مائیکل... وہ ہوتے ہی اچھے ہیں۔“

مفت میں

محمد شاہد فاروق۔ پھلور

انکل سوچ دین اور آنٹی جھگڑالنساء کی جوڑی بھی کیا خوب جوڑی تھی۔ آنٹی کسی شیر کی طرح دھاڑتی تھیں، لیکن ان کی دھاڑنے کی یہ کارروائیاں ہمیشہ یک طرفہ ہوتیں، کیونکہ انکل ان کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بنے نظر آتے اور اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرنے میں لگے رہتے اور یہ بھی اتفاق تھا کہ ان کی یہ سب تدبیریں الٹی ہوجاتی تھیں اور انھیں ہمیشہ لینے کے دینے پڑجاتے۔

چھوٹی عید کے لگے مہنگائی کے زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ بڑی عید سر پر آپہنچی اور بڑی عید کیا قریب آئی، انکل سوچ دین کی جان ہی مصیبت میں پھنس گئی۔ ہر روز صبح ایک ہی سوال سننے کو ملتا۔

تمھیں کچھ خبر ہے کہ قربانی میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ قربانی کے جانور کا بندوبست کرلو، مگر تمہارے کان پر ابھی تک جوں نہیں رینگی۔ آنٹی جھگڑالنساء نے انکل سوچ دین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے اور اب جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کرنے میں مصروف تھے۔

”بیگم عید ابھی گزری نہیں بلکہ عید ابھی آنی ہے۔ اگر عید تک جانور کا بندوبست نہ ہوا تو قصائی سے کہہ کر مجھے ذبح کروا دینا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے قصائی کی بھی کیا ضرورت ہے۔“ انکل سوچ دین نے ہر روز کی تکرار سے تنگ آکر جلے کٹے لہجے میں کہا۔

”ہائے! میں صدقے جاؤں۔ اگر عید تک قربانی کا جانور نہ آیا تو تمہارا یہ ارمان بھی پورا کردوں گی۔ میرا نام بھی جھگڑالنساء ہے۔“ آنٹی نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

انکل سوچ دین آنٹی کے تیور دیکھتے ہوئے آہستہ سے اٹھے اور باہر کی طرف چل دیے۔

”اب کدھر چل دیے۔ کبھی ڈھنگ سے بات نہ سننا۔ ہمیشہ کھسکنے کی کرنا۔“ آنٹی جھگڑالنساء نے دہلیز عبور کرتے انکل سوچ دین پر آخری وار کیا۔

”میں ذرا ماکھے قصائی کی طرف جارہا ہوں۔“ انکل سوچ دین نے پلٹ کر جواب دیتے ہوئے کہا اور ساتھ میں اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا جس کا مطلب تھا کہ پیچھے سے مزید کوئی حملہ نہ کیا جائے۔

انکل سوچ دین اپنے مخصوص انداز میں سوچتے ہوئے ماکھے قصائی کے باڑے میں پہنچ گئے جسے اس نے آج کل فارم کا نام دے رکھا تھا۔

”آؤ چاچا سوچ دین! کیسے آنا ہوا؟“ ماکھے نے انکل سوچ دین کو دیکھتے ہی میزائل کی طرح سوال داغ دیا۔

”کسی جانور کے سودے کے لیے ہی آیا ہوں اور کون سا تجھ سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ لینا ہے۔“ انکل سوچ دین نے آنٹی کا غصہ ماکھے پر نکالتے ہوئے کہا۔

”چاچا! لگتا ہے آپ پھر چاچی کی فاسٹ باؤلنگ کا سامنا کرکے آرہے ہو اور چاچی نے آج پھر کوئی خطرناک باؤنسر مار دیا ہے۔“ ماکھے نے ایسے ہنستے ہوئے کہا جیسے گھر کا بھیدی ہو۔

”اچھا! اب بس کر اور میں جس کام سے آیا ہوں وہ کر۔“

انکل سوچ دین نے کھسیانے انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور ماکھے کو لے کر اس طرف کو چل دیا جدھر گائیں اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

اور پھر آدھ گھنٹے کے بعد سوچ دین اور ماکھے کی واپسی ہوئی تو چاچا کے ہاتھ میں گائے کی رسی تھی۔

”بیگم! ارے بیگم! کہاں ہو۔“ انکل سوچ دین نے گھر میں داخل ہوتے ہی فاتحانہ انداز میں کہا۔

”اب کیا قیامت آگئی ہے جو اتنا شور مچا رکھا ہے۔“ آنٹی نے ایک کمرے سے برآمد ہوتے ہوئے کہا مگر جونہی ان کی نظر گائے پر پڑی، ان کا غصہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے حیرت میں تبدیل ہوگیا۔

”ہائے میں مرگئی! اتنی خوب صورت گائے! یہ آپ ہی لائے ہیں نا؟“ آنٹی نے یقین نہ آنے والے انداز میں پوچھا۔

”تو کیا تیرے میکے والے چھوڑ کے گئے ہیں۔“ انکل سوچ دین نے اس انداز میں کہا کہ آواز آنٹی تک نہ پہنچ سکے۔ ویسے بھی وہ گائے دیکھنے میں مگن تھیں، ورنہ اس موقعے پر پانی پت کی لڑائی کی یاد تازہ ہوسکتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ گائے کو گلی میں باندھتے ہیں، تاکہ محلے والوں کو بھی پتا چلے کہ ہم اس بار گائے کی قربانی کررہے ہیں۔“

اور پھر گائے کو گلی میں باندھ کر چارا ڈال دیا گیا۔ شام کو اچانک آنٹی جھگڑالنساء کو اپنے بھائی کی طرف جانا پڑ گیا، کیونکہ اچانک اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔

”گائے کا خیال رکھنا اور رات کو چارپائی باہر ہی ڈال لینا۔“ آنٹی نے روانہ ہوتے وقت انکل سوچ دین کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! تم دھیان سے جاؤ۔“ انکل سوچ دین نے بے زار سے لہجے میں کہا۔ انھیں آنٹی کی نصیحت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

رات کو انکل سوچ دین نے آنٹی کی نصیحت کے مطابق چارپائی گائے سے تھوڑے فاصلے پر ڈالی اور سوگئے۔

رات کے کسی پہر آہٹ سے انکل سوچ دین کی آنکھ کھلی تو گائے کے قریب دو آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ انکل سوچ دین نے سہم کر آنکھیں بند کرلیں اور وہ آدمی گائے کھول کر

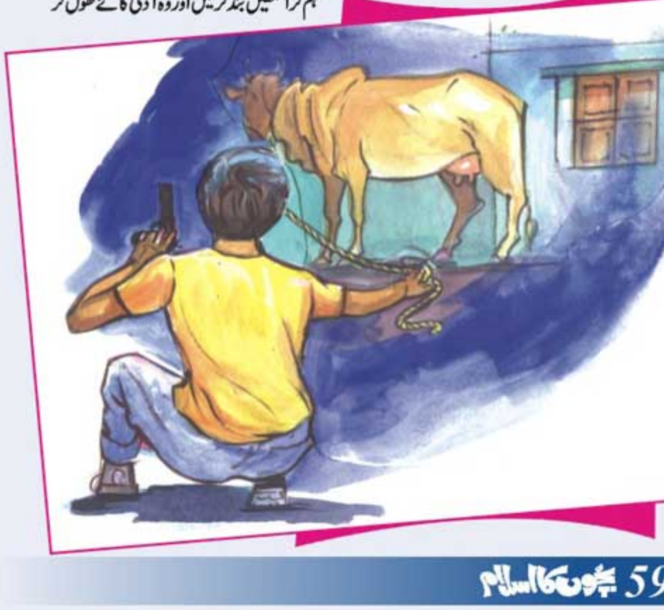

لے گئے۔ اسی طرح لیٹے لیٹے انکل سوچ دین کی پھر آنکھ لگ گئی۔

''چاچا! چاچا!'' ایک آدمی نے انکل سوچ دین کو جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے؟ اور کون ہو تم؟'' انکل سوچ دین نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''ہمیں ماکھے نے بھیجا ہے۔ گائے کہاں ہے۔ یہیں رکھ لی؟'' اس آدمی نے انکل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ تو تم تھوڑی دیر پہلے کھول کر لے گئے تھے، اب مجھے کیا پتا کہ گائے کہاں ہے؟'' انکل سوچ دین نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ صاف بات بتاؤ، ورنہ ماکھا صبح خود تم سے نمٹ لے گا۔'' اس آدمی نے غصے اور حیرانی سے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری آنکھ کھلی تو دو آدمی گائے کے قریب کھڑے تھے۔ میں تو یہی سمجھا کہ یہ تم ہو اور میں آنکھیں بند کر کے پڑا رہا اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ اب تم پھر مجھ سے گائے کا پوچھ رہے ہو۔'' انکل سوچ دین نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، صبح ماکھا خود ہی تم سے بات کرے گا، ہم تو جا رہے ہیں۔''

اس آدمی نے کہا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور پھر دونوں گلی کی نکڑ پر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

''ہاں بھئی چاچا سوچ دین! تیرا کیا خیال ہے کہ تو مفت میں گائے ہضم کر جائے گا۔'' ماکھے قصائی نے صبح انکل سوچ دین کے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا۔ اس کے پیچھے چار پانچ اور آدمی بھی گھر میں داخل ہو گئے اور انکل سوچ دین کی حالت ماکھے اور اس کے آدمیوں کو دیکھ کر ایسی ہو گئی جیسے عدالت میں کسی مجرم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔

''ماکھے پتر! میں سچ کہہ رہا ہوں کہ دو آدمی گائے کو کھول کر لے گئے اور میں انھیں تمہارے آدمی سمجھ کر خاموش لیٹا رہا۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ تمہارے بھیجے ہوئے آدمی نہیں بلکہ اصلی چور ہیں۔ میں نے تو تمہاری چاچی کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کے لیے تم سے تین ہزار میں ایک دن کے لیے گائے ادھار لی تھی۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری گائے چور لے جائیں گے۔'' انکل سوچ دین نے رو دینے والے لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

چاچا! چور میری گائے نہیں بلکہ تمہاری گائے لے کر گئے ہیں اور تمہیں پتا ہے کہ اس گائے کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی۔ اب میں اپنا 37 ہزار پورا کر کے ہی جاؤں گا۔'' ماکھے نے بڑے بے نیازانہ انداز میں کہا اور ساتھ ہی اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا اور انھوں نے بڑی پھرتی سے بیڈ، صوفہ، فریج، اور ٹی وی اٹھا اٹھا کر باہر کھڑے چھوٹے ٹرک پر لاد دیے۔

''اچھا چاچا! میں اپنا نقصان پورا کر کے جا رہا ہوں۔ اب تم چوروں کو ڈھونڈ کر چاچی کے سامنے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کرو، ورنہ چاچی تمہیں گائے سمجھ کر بوٹی بوٹی کر دے گی۔'' ماکھے نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔

اور انکل سوچ دین کی تو یہ سوچ سوچ کر ہی جان جا رہی تھی کہ جھگڑالنساء کے آنے کی دیر ہے، پھر صورت حال معلوم ہوتے ہی ''سوچ دین کی قربانی'' یقینی تھی اور یہ سوچ کر ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

ہماری دو باتیں

اک مدت سے ''دو باتیں'' پڑھ پڑھ کر یہ علم ہوا کہ ''دو باتیں'' کے لیے ''دو باتیں'' بہت ضروری ہیں۔ ایک ''دو باتیں'' لکھنے والے کی ذہانت اور دوسری بات سے بات نکالنا۔ ہماری ذہانت کے بارے میں تو کسی کو شک نہیں (سوائے ہمارے اہلِ خانہ کے) اور بات میں سے بات نکالنے کے ہم ماہر ہو ہی گئے۔ دو باتیں کی بدولت اور اب حالت یہ ہے کہ ''دو باتیں'' کرنے بیٹھیں تو ''دو سو باتیں'' با آسانی ہو جاتی ہیں (بغیر حساب کتاب) اور پھر اس کے بعد بھی لگتا ہے کہ ''دو باتیں'' تو رہ ہی گئیں باتوں باتوں میں اور پھر ''دو باتیں'' میں بھی تو کام کی کوئی ایک آدھ بات ہوتی ہے اور بس، لہٰذا ابھی ابھی احساس ہوا کہ ''دو باتیں'' ہم بھی لکھ سکتے ہیں، کیونکہ صرف دو باتیں گھما پھرا کر واپس اپنی جگہ لانی اور ''دو باتیں'' میں صرف ایک صفر (زیرو) کا اضافہ ہی تو کرنا ہے۔ دسویں سالنامے میں پڑھا تھا کہ ''دو باتیں'' ''سنتے سنتے'' مدیر صاحب کی پوری ایک ہزار باتیں سن چکے ہیں اور پھر ان ہزار میں کئی ہزار اور ہوں گی یہ حساب تو ''بچوں کا اسلام کا خطاب'' لکھنے والے بھی نہ لگا سکے۔ اب ہم مزید ایک سال کی ''دو باتیں'' پڑھنے کے بعد کیسے لگا سکتے ہیں۔ ویسے ''دو باتیں'' کے دوران لگے ہاتھوں آپ کو ایک کام کی بات بتاتے چلیں اور وہ یہ کہ اگر آپ کسی ''دو باتیں'' والے کی باتوں سے تنگ ہوں اور چاہیں کہ اس کا باتوں کا مرض جاتا رہے اور اس کی باتوں میں ''مزید باتوں'' کا اضافہ نہ ہو تو، اُسے ''دو باتیں'' سے مکمل پرہیز کروائیں اور اگر پھر بھی افاقہ نہ ہو تو آپ اپنی ''دو باتیں'' شروع کر دیں۔ آپ کی ''دو باتیں'' سن سن کر وہ باتیں بھول جائے گا۔ اس سے پہلے کہ آپ کے پاس ابھی مزید ''دو باتیں'' موجود ہوں اور آپ پر ''دو باتیں'' کی اہمیت و افادیت آشکارا ہو جائے گی، ارے! ارے یہ کیا، ہمیں تو لگتا تھا کہ ہم ''دو باتیں'' لکھ سکتے ہیں، لیکن اب ''دو باتیں'' لکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم ''دو باتیں'' نہیں لکھ سکے اور ''دو باتیں'' لکھنے کے لیے ہمیں دیسی گھی پینا پڑے گا۔ جو کہ آج کل بڑی مشکل سے ملتا ہے، کیونکہ ہم تو اپنی ''دو باتیں'' کو نہ تو گھما پھرا سکے اور نہ ہی ''دو باتیں'' کے دوران بات میں بات نکلی اور ہماری ''دو باتیں'' صرف ''دو باتیں'' تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔ افسوس! فقط والسلام بھی۔

شمسہ کنول بنت عبدالرزاق۔ ایبٹ آباد

آمنے سامنے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ:

نوٹ: خطوط کے انبار میں سے منتخب کردہ کچھ خطوط اس شمارے میں لگائے جارہے ہیں... سالنامے کے بارے میں موصول ہونے والے باقی خطوط آیندہ شماروں میں شائع کیے جائیں گے...

پہلے تین خط انعامی قرار پائے۔ انعامی رقم روانہ کی جارہی ہے۔ صرف ایک صفحے والے تبصرے انعامی مقابلے میں شریک کیے گئے ہیں۔ طے شدہ بات کی پابندی اہم ہے۔ اکثر بہترین خطوط پر پتے ہی نہیں تھے، اس لیے انعامی مقابلے سے رہ گئے۔

○

پہلا انعامی خط

اللہ اللہ کر کے سالنامہ ملا۔ عمدہ ٹائٹل اور شان دار تحریریں دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ بوڑھے شخص کی ڈائری، ماضی کا ایک ورق اور مدیر صاحب کی سوچ کا سمندر کا مرکزی خیال ایک ہی تھا، البتہ مدیرِ محترم کی "سوچ کا سمندر" پہلے نمبر پر رہی۔ بہت متاثر کن تھی۔ اسی طرح سرور مجذوب کی "ماموں" اور ایک دوسری کہانی "ادھار پھانسی" بھی ایک ہی موضوع پر تھیں۔ گوگا ڈاکو نے اپنی پھانسی ادھار کی اور اپنی آخرت سنوارنے میں لگ گیا۔ اُدھر رابیل محمد خان کی "بے بسی" اور واہ کینٹ کے بلال پاشا کی کہانی، دونوں بدگمانی سے متعلقہ تھیں۔ رابیل نے کاروالی (شافعہ) کا حال لکھا۔ پہلے تو اسے مانگنے والی عورت پر ترس آیا، لیکن پھر شیطان کے بہکاوے میں آگئی اور آخر کار اُسی کے صدمے سے دوچار ہوئی۔ ضیاء اللہ محسن نے ساہیوال والوں کا جو کھرا (سچا) واقعہ لکھا، وہ بھی متاثر کن تھا۔ اُن کی سالانہ رپورٹ بھی خوب رہی مگر محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے کچھ بے دلی سے لکھی ہے (معذرت) جو لوگ دوسروں کی قدر نہیں کرتے، اُن کے لیے سارہ الیاس کی "ٹھوکر" ہے۔ اسلام آباد سے اسلم بیگ کا خود ساختہ انٹرویو بھی کمال کا تھا۔ آصف مجید صاحب (لاہور) دنیا کی بے ثباتی سمجھا کر آخرت کی فکر دلا رہے تھے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر رہے تھے۔ صحابہ کے واقعات پڑھ کر بھی دل خوش ہوتا ہے۔ ایسی تحریر مدیرِ محترم کے لیے "آم کے آم، گٹھلی کے دام" کے مصداق ہے۔

انیسہ سعدیہ (مدھریانوالہ کالر) ٹافیاں بانٹ کر ہمسائے کے حقوق سمجھا رہی تھیں اور اُن کی بہن (نفیسہ) مزاحیہ تحریر کے ساتھ حاضر ہوئی ہیں۔ محمود اشرف (ملائیشیا) بیٹی سے سلوک کی ترغیب دے رہے تھے۔ "کس کا تحفہ" میں سالار کی خلوصِ دل سے کارکردگی، انعام کے نشے میں مست کو بیدار کر گئی۔ کم عمر کا "آخری وار" پڑوسی ملک کو منہ توڑ جواب تھا (ف۔ک۔ انصاری) ہماری "چند یادیں" بھی سالنامے میں جگہ بنا گئیں۔ اللہ کا شکر ہے، البتہ سالنامہ لیٹ ہونے کی وجہ سے یہ بھی کافی لیٹ ہوگئیں۔ "خاموش ہتھیار" کا انجام اچھا اور حیران کن رہا۔ لاہور والے محمد جادو سے بچنے کے طریقے سکھا رہے تھے۔ سرگودھا والے اسامہ "مادام کیوری" سے متعلقہ تحریر لکھ کر سائنسی مضمون کی کمی پوری کر گئے (ریڈیم) "ہماری زندگی کا مقصد اللہ کو راضی کرنا ہے" ایک طالب علم کا ڈاکٹر عادل کو درس (میری زندگی کا مقصد) ہٹلر چاچی اور پانچ کا گروہ۔ نہلے پہ دہلا یا جیسے کو تیسا۔ شاہد فاروق صاحب کی خبروں کی رم جھم قابلِ داد ہوتی ہے۔ (نورالامین۔ گلی نمبر 3 مکان نمبر 207 مشتاق کالونی میاں چنوں)

○

دوسرا انعامی خط

سب سے پہلے اتنا بہترین سالنامہ نکالنے پر مبارک باد۔ مجھے جس کہانی نے یہ خط لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یاسمین صاحب کی کہانی "خوشی کے آنسو" ہے۔ یہ کہانی میں نے دو، تین مرتبہ پڑھی۔ اس کہانی کے ہر ہر لفظ نے ہم سب گھر والوں کو اتنا متاثر کیا کہ ہم دنگ رہ گئے۔ اس موضوع پر پہلی مرتبہ اتنی خوب صورتی اور بہترین دلائل کے ساتھ کہانی پڑھنے کو ملی۔ واقعی ہمیں کمی نظر آتی ہے تو صرف لیڈی ڈاکٹرز کی حالانکہ کمی ہے تو امہات المومنین اور صحابیات جیسی نیک خواتین کی۔ محمد اسلم بیگ صاحب کی تحریر "امتحان" بھی بہت اچھی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھتی رہی کہ یہ انٹرویو حقیقت پر مبنی ہے۔ بالکل آخر میں جا کر پول کھلا۔ اس کے علاوہ کہانیاں، بے بسی، ماموں، ٹھوکر، ماضی کا ایک ورق، ٹافیاں، میری زندگی کا مقصد، مناسب مگر پرانے طرز کی کہانیاں لگیں۔ "واقعات صحابہ کے" ہمیشہ کی طرح پڑھنے میں مزہ آیا۔ کہانی "آنسوؤں کے سائے تلے" پڑھ کر بچھڑنے والوں کے دوبارہ ملنے پر مجھے بھی خوشی محسوس ہوئی۔ "ایک بوڑھے شخص کی ڈائری" نئے طرز کا مضمون تھا۔ ڈاکٹر فرقان نے بڑی عمدگی سے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ اپنے بچوں کے ساتھ سخت رویہ نہ رکھیں، ورنہ آپ بڑھاپے میں تنہا رہ جائیں گے۔ یہ کہانی زیادہ تر بوڑھوں کی ہے، چاہے وہ گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوں یا اکیلے۔ کہانی "ہٹلر چاچا" میں چاچی کو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے خائن لوگوں سے ملایا گیا ہے، جو بہت بے ادبی والا جملہ لگا۔ کہانیاں مزاحیہ لکھیں، لیکن ادب کے دائرے میں رہ کر لکھیں۔ دو باتوں میں اثر جون پوری صاحب کی طبیعت پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جلد از جلد دائمی شفا عطا فرمائیں۔ (آمین)۔

(اختِ میجر احمد۔ A-101 بلاک 2 گلشنِ اقبال کراچی)

○

تیسرا انعامی خط

مزاج شریف! "بچوں کا اسلام" بصورت سالنامہ بعد از انتظار موصول ہوا۔

سرورق پر حضرت جون پوری کی کمی محسوس کی ہی تھی کہ "دو باتیں" میں ایکسیڈنٹ کا پڑھ کر مزید دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت سے نوازے۔ آمین!

(1) مجموعی طور پر رسالے میں تربیت و اصلاح خصوصاً بچوں کی تربیت کا عنصر غالب رہا (الحمدللہ)

(2) سرور مجذوب کے حوالہ سے ہم ذہن صاف کرتے ہیں مگر بعض پرانے اور ذمہ دار رائٹر حضرات پھر ہمیں تشویش میں مبتلا کر دیتے ہیں (جیسا کہ اس رسالہ میں یہ چیز موجود ہے) مگر آ گئیں "آمنے سامنے" میں وضاحت پڑھ کر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی۔

(3) مضامین کہانیوں کے اعتبار سے، بے بس، امتحان، ایک اہم خط (ثاقب نصیر اور دوسرا محمد احمد کا دونوں ہی) آنسوؤں کے سائے تلے، ماموں، ٹافیاں، سوچ کا سمندر، کس کا تحفہ، آخری وار، گزر گیا ایک سال اور، واقعات صحابہ قدم بہ قدم، کو بہترین محسوس کیا گیا۔

ٹھوکر، ادھار پھانسی، خوشی کے آنسو، ریڈیم کی دریافت، نیلا قالین، زیتون کو بہتر اور ایک بوڑھے شخص کی ڈائری، جادو کے اثرات، ماضی کا ورق، کہانی ہم نے لکھی، سبق سکھا گیا، یہ بیٹیاں، پانی کا بلبلہ، میری زندگی کا مقصد، چند یادیں، ہٹلر چاچا، معاشرے کے تیر اور نیوز چینل متوسط درجہ کے محسوس ہوئے۔

(4) آنسوؤں کے سائے تلے شروع کرتے ہی حقیقت ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ آخر میں معلوم ہوا واقعی حقیقت ہی ہے۔

(5) حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ کی مثالی نعت مگر ان کے نام کے بغیر؟ دکھ ہوا۔

(6) "عدالت بچوں کا اسلام" کے مضمون کی طرف اعلیٰ انتظامیہ کو خصوصی توجہ دے کر انصاف پہ مبنی فیصلہ کرنا چاہیے۔

(7) دوسروں سے آگے نکل جانے کا ہنر، دیگر ملفوظات، بہت بہتر رہے۔

(8) چاچا ہٹلر عنوان میں "چاچا" مگر تفصیل مضمون میں چاچی بن گئی۔ سبحان اللہ!

(9) اشتہارات توقع سے کم تھے۔ اگر زیادہ ہوتے تو بھی زیادہ خوشی ہوتی۔

(10) مضامین اور کہانیوں سے بطور خاص، فضول خرچی سے بچنے، ہمدردی و خیر خواہی، احتیاط، غیرت ایمانی کو بیدار کرنے کی ضرورت، تربیت اولاد، بہترین منتظم، تقویٰ آزمانے کی بحث، برے ماحول سے بچنے، عقائد و نظریات کی اصلاح، حقوق العباد، والدین کا ادب و احترام، دیانت داری و اخلاص، قربانی و بہادری، دنیا اور اس کے عیش و عشرت کی بے ثباتی، سائنس و طب کی معلومات، اسلام کے امت کی بیٹیوں پر احسانات کا احساس ہوا، علماء امت سے محبت و عقیدت، گناہوں کا وبال آخرت سے پہلے دنیا میں بھی، بے جا و بلا تحقیق بدگمانی سے بچنے اور دیگر بے شمار اسباق ملے، جزاہم اللہ احسن الجزا۔

بہرحال مجموعی طور پر قابلِ رشک سالنامہ کی اشاعت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کی محنت کو درجہ بدرجہ قبول فرمائے۔ آمین۔ (آپ کی بیٹی اسعدیہ فیضی بنتِ عبدالمجید فیضی اقراء روضۃ الاطفال مکان نمبر 4 سرور روڈ راولپنڈی صدر)

○

چمکتے دمکتے ٹیڑھے راستوں پر ٹیڑھے پہیوں والی گاڑی چلاتے "بچوں کا اسلام" کے عنوان کے بغیر سرورق لہراتے ہرے بھرے راستوں اور گیارہ سال کا تکونی پرچم لیے سرورق بہت ہی پیارا تھا۔

جب اندر کا حصہ کھولا تو وہ سرورق سے بھی پیارا نکلا۔ القرآن اور الحدیث کو حالات کے مطابق چنا گیا ہے جب کہ دو باتیں میں ایک خوش خبری سنائی تو دوسری افسوس ناک خبر تھی۔ اللہ ان کو شفا دے۔ سب سے پہلے نمبر پر کہانی ہٹلر چاچا، ماموں اور میری زندگی کا مقصد پسند

بقیہ: آخرت میں

صحیح نہیں کرتے۔ کام صحیح نہیں ہوگا تو مالک مجھ سے خفا ہوگا۔

ایک روز شام کو فیکٹری سے آتے ہوئے میری موٹر سائیکل ایک ویگن سے ٹکرا گئی۔ میں الٹ کر گرا اور سارا بوجھ میرے ایک بازو پر پڑنے کی وجہ سے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

دو دن آرام کے بعد جب فیکٹری پہنچا تو میرے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ کسی نے بھی مجھ سے میرا حال نہ پوچھا۔ میں خاموشی سے فیکٹری ورکرز کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک جگہ میرے قدم رک گئے۔ وہاں تین ورکرز آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ مشین کی آڑ میں کھڑا، میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''لگتا ہے، لاٹ صاحب کو کہیں سے چوٹ لگی ہے۔'' یہ غلام محمد کی آواز تھی اور وہ مجھے طنزاً ''لاٹ صاحب'' کہہ رہا تھا۔

''چوٹ ووٹ نہیں لگی ہوگی، کسی کو گالی دے بیٹھا ہوگا۔'' دوسری آواز جو راشد علی کی تھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے راشد؟ وہ ہمارے استاد ہیں۔'' یہ آواز اشرف کی تھی۔

''ہنہ استاد! ایسے ہوتے ہیں استاد؟ زبان دیکھی ہے اس کی زہر اگلتی ہے زہر۔'' راشد علی جلے کٹے انداز میں کہہ رہا تھا۔

'تو تم جو انھیں پیٹھ پیچھے گالی دے رہے ہو! یہ صحیح ہے کیا؟ تمھیں نہیں معلوم کہ اگر تم انھیں گالی نہ دو تو ان کا گالی دینا تمہارے لیے کتنا فائدہ مند ہو سکتا ہے؟'' اشرف نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

''فائدہ مند؟ وہ کیسے؟ اس کے گالی دینے سے تو ہمارا دل خراب ہوتا ہے، ہم تو دل میں اسے ہزار گالیاں دیتے ہیں۔'' غلام محمد نے کہا۔

''دیکھو بھائیو آخرت میں وہ شخص جس نے کسی پر ظلم و زیادتی کی ہوگی، کسی کو بلاوجہ مارا ہوگا، یا کسی کو گالی دی ہوگی، اس کے نیک اعمال مظلوم کو دے دیے جائیں گے اور نیک اعمال ختم ہو گئے تو مظلوم کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے۔'' اشرف نے بڑے پُر اعتماد انداز میں دونوں کو سمجھایا۔

''واہ! پھر تو ٹھیک ہے لاٹ صاحب! انہیں نوید صاحب ہمیں دیتے رہیں گالیاں، ہم آخرت میں لے لیں گے ان کی نیکیاں۔'' راشد نے اس مرتبہ بڑے ادب سے میرا نام لیا۔

ایک تو میرے ہاتھ کی تکلیف پر کسی نے مجھ سے اظہار ہمدردی نہیں کیا تھا، دوسرے ان تینوں کی گفتگو سن کر میں ٹوٹ سا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھ کر اور اللہ کا ذکر کر کے سمجھتا تھا کہ میں کافی لوگوں سے زیادہ بہتر ہوں جب کہ میں تو حقیقت میں خالی ہاتھ تھا۔ باقی وقت میں نے بڑی مشکل سے فیکٹری میں گزارا۔ شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر میں مسجد میں ہی بیٹھا رہا، بغیر کسی کوشش کے میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میں اپنے رب سے اپنے اتنے بڑے گناہ کی معافی مانگ رہا تھا۔ پھر میں ایسا بدلا کہ میری فیکٹری کے تمام لوگوں کی حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میرا رویہ کیا بدلا، سب ہی بدل گئے۔ ایک روز ایک ورکر کو کچھ ہدایت دیتے ہوئے میری انگلی مشین میں آ گئی۔ خون تیزی سے نکلنے لگا جس ورکر نے دیکھا، پریشان ہو کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ان سب کا یہ جذبہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اسی رات میں نے وہی خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا میں راستہ بھول گیا تھا مگر پھر ایک روشن اور واضح راستہ مجھے نظر آنے لگا اور میں مسکرا کر اس راستے پر چل پڑا جہاں سے مجھے اپنی منزل واضح نظر آ رہی تھی۔

ویٹریاں

- ویٹر! آج دال بہت اچھی پکی ہے، اس میں کیا ڈالا ہے؟
  ''کل کی بچی ہوئی دال سَر۔''
- ویٹر! تمہارے ہاں چٹنی کس چیز کی بنتی ہے؟
  ''گاہک کی سَر۔''
- ویٹر! آج سالن میں بدبو محسوس ہو رہی ہے؟
  ''بدبو! ہرگز نہیں سَر! آج تو باورچی نے گوشت صابن سے دھو کر پکایا ہے۔''
- ویٹر! آج تو مجھے کوئی اچھی سی ٹیبل چاہیے؟
  ''تو سَر آپ کسی فرنیچر والے کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟
- ویٹر! کیا تمہاری شکایت میں مالک سے کر سکتا ہوں؟
  ''ہرگز نہیں سَر! البتہ مالک کی شکایت آپ مجھ سے کر سکتے ہیں۔
- ویٹر! تمہارا کھانا تو باہر پھینکنے کے قابل بھی نہیں؟
  بالکل سَر! اسی لیے تو آپ کو دیا ہے۔
- ویٹر! تمہارے باورچی کے ہاتھ میں بہت لذت ہے؟
  ''سَر! اس وقت آپ باورچی کے ہاتھ نہیں، بلکہ بھینس کے پائے کھا رہے ہیں۔''
- ویٹر! تمھیں پتا ہے کہ تمہارے ہاں کا کھانا کھا کر میں کیا سوچتا ہوں؟
  ''بالکل سَر! یہی کہ بیوی کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزوں کی قدر کرنی چاہیے۔''

حافظ محمد اشرف۔ حاصل پور

آئی۔ ویسے ہٹلر چاچا میں کہانی تو چاچی پر تھی، پھر عنوان چاچا کا کیوں؟ دوسرے نمبر پر تمام کہانیاں اچھی لگیں۔ سوچ کا سمندر اور ماضی کا ایک ورق ایک ہی موضوع پر تھیں۔ ''ٹھوکر'' پڑھی تو پتا چلا، ہمیشہ خاموش رہنا ہی صحیح نہیں بلکہ کبھی کبھی بول بھی دینا چاہیے۔ ''نیوز چینل'' تو ہمیں ویسے ہی بہت پسند ہے، لیکن اس دفعہ کا نیوز چینل تو سالنامہ کی طرح سالانہ تھا۔ لطیفے بہت کم دیے گئے لیکن اچھے تھے۔ ''پانی کا بلبلہ'' نے موت یاد دلا دی۔ ''امتحان'' میں ضیاء اللہ محسن کو جو جواب دیا، وہ بہت پسند آیا۔ ''چند یادیں'' میں آپ نے تو بطور مدیر خوشبو کا تحفہ لے لیا، کیونکہ بطور مدیر آپ ان کے ساتھ تھے۔ پھر دوبارہ مدیر کے نام سے کیوں لیا۔ یقیناً یہاں سرور مجذوب کا نام ہوگا۔ آپ نے گول کیا ہے۔ کہانی ہم نے لکھی ہے میں نفیسہ صاحبہ نے رابیل صاحبہ لکھا ہے تو کیا یہ لڑکی ہیں۔ مجھے تو یہ لڑکے کا نام لگتا ہے۔ اچھی لکھی ہے۔ ایسی مزاحیہ کہانیاں لے کر آتی رہا کریں۔ ریڈیم کی دریافت اور زیتون دونوں معلوماتی مضمون تھے۔ دونوں اہم خط میں بہت ہی اہم باتوں کی نشاندہی کی گئی۔ غرض پورا رسالہ خوب تھا۔ اس سالنامہ کو تیار کرنے والے تمام لوگوں کو مبارک ہو۔ اللہ کامیابیاں عطا کریں۔ آمین۔

(عندلیب اسلام۔ اورنگی ٹاؤن کراچی)

O

سالنامہ بچوں کا اسلام پڑھا، بے حد مزا آیا، خصوصاً آپ کی کہانی ''سوچ کا سمندر'' انتہائی فکر انگیز تھی، اسی لیے تو آپ سے بار بار گزارش کرتا ہوں کہ آپ ایک کہانی (اشتیاق احمد کے نام سے یا سرور مجذوب بن کر) ضرور لکھا کریں، جب دوسرے رسائل والے پیسے دے کر آپ کی کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمارا اپنا ادارہ آپ کی کہانیوں سے کیوں محروم رہے؟ اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ اس طرح آپ مزید جگہ گھیر لیں گے تو اسے چاہیے کہ ''سوچ کا سمندر'' جیسی کہانیاں لکھ کر بھیجا کرے۔ باقی رسالہ بھی بہت خوب تھا، اب چند شماروں کے بعد شمارہ نمبر 600 بھی خصوصی ہوگا، پھر اب تو سالنامہ بھی آٹھ نو مہینوں کے بعد آ جائے گا۔ (جمیل الرحمٰن عباسی۔ بہاول پور)

فقیر کہانی

ف، ح۔ کراچی

ماموں بڑے عرصے کے بعد کراچی سے لاہور آرہے تھے۔ ہم سب ائیر پورٹ سے ماموں کے ساتھ آئے تو ماموں نے اپنی عادت کے مطابق فوراً بیگ کھول دیا۔ سب کو تحفے، تحائف دیے۔ ماموں امی کے لیے خاص سینریاں لائے تھے۔ سب تحفے تحائف اٹھا کر اپنے کمروں میں لے گئے۔ میں نے امی کی سینریاں اٹھائیں اور امی کے کمرے میں رکھ دیں۔ ماموں امی کو سینریاں دکھانے لگے۔

"ماموں جان! ہم سب کے تحفے آگئے، میرے کامی کا تحفہ۔" میں نے ماموں سے کہا۔ یہ سن کر ماموں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کامران کے اغواء ہونے کا واقعہ ان کی نظروں میں گھوم گیا۔ وہ امی کے ساتھ سکول سے آرہا تھا۔ امی نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور اس کے لیے دکان سے سامان لیا جب واپس مڑیں، کامی موجود نہیں تھا۔ کامی سمجھ دار لڑکا تھا، اس کی عمر 12 برس تھی۔ پہلے تو امی نے سمجھا کہ شرارت کر رہا ہے، لیکن یہ ایک خطرناک حقیقت تھی جو ہر طرف سر ٹکرانے کے باوجود سمجھ میں نہ آئی۔

"بیٹا مجھے کامی بہت اچھی طرح یاد ہے! تمہارا بھائی معلوم نہیں۔" ساتھ ہی امی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔

"کک... کیا... نن... نہیں... مم... میر... میرا کامی..." امی کے ہاتھ میں سینری کے اوپر لگا ہوا اخبار کا ٹکڑا تھا۔ اخبار کے اوپر لگی ہوئی ایک تصویر پر ان کی نظریں جم چکی تھیں۔

"یہ... یہ... د... دیکھو..." انھوں نے اخبار کا وہ ٹکڑا ماموں کی طرف بڑھا دیا۔ یہ کراچی کے ایک اخبار کا ٹکڑا تھا، اخبار ایک مہینہ پرانا تھا۔ اس پر ایک سڑک کے پاس گندے نالے کی تصویر تھی۔ نالے کے ساتھ ایک بچہ فقیر کی صورت میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ تھا۔

"ہاں کیا ہوا باجی! کیا ہے اس تصویر کو۔" ماموں حیران ہوئے۔

"یہ میرا کامی ہے! میرا کامران۔" امی چیخیں۔

"یہ ناممکن ہے... یہ کامی نہیں ہوسکتا، کامی اتنا خوب صورت گول مٹول سا تھا، یہ تو کالا سا لڑکا ہے اور یہ تو بھکاری ہے۔" ماموں نے دلیل دی۔

"کامی کے کھڑے ہونے کا انداز یہی ہے، میرے بچے تو کدھر ہے۔" امی اخبار کے ٹکڑے پر گر گئیں اور اس کو چومنے لگیں، یہ منظر دیکھ کر ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ماموں نے فوراً فون ملایا۔ اخبار کے ایڈیٹر سے رابطہ ہوا۔ اس سے فوراً یہ تصویر منگوائی تھی۔ ماموں کے تعلقات چونکہ کافی تھے، اس لیے ایک فون کال پر تصویر ای میل کردی گئی۔ رنگین تصویر میں بالکل واضح فقیر دکھائی دے رہا تھا، لیکن یہ چہرہ کامی کے چہرے سے مختلف تھا، امی کی ضد تھی کہ یہی میرا کامی ہے جب کہ باقی سب کا کہنا تھا کہ یہ کامی نہیں ہوسکتا۔ ماموں کو امی کی بات پر کچھ شک ہوا تو انھوں نے اپنے ذرائع استعمال کیے۔ امی کو وہ تصویر کاغذ پر نکلوادی، لیکن امی کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

"امی! یہ فقیر کامران کیسے ہوسکتا ہے، دیکھیں کتنا دبلا پتلا ہے۔"

"کیا کامی دو برس گھر سے دور رہ کر دبلا نہیں ہوسکتا۔" امی کا جواب وزنی تھا۔

"امی اس کے سر کی بناوٹ دیکھیں، کامی کا سر بالکل گول ہے، اس کا سر لمبوترا سا ہے۔" کسی نے دلیل دی۔

"یہ تصویر ہے کوئی حقیقت میں اسے نہیں دیکھ رہے کہ تم مکمل فیصلہ دے سکو۔" امی نے بغیر سر پیر کے جواب دیا۔

"اس کی گردن دیکھو، لمبوتری ہے جیسے کامی کی تھی۔ بازو اس نے ایسے ہی لٹکائے ہوئے ہیں جس طرح کامی لٹکاتا تھا۔ اس طرح پاؤں کھول کر کھڑا ہوتا، جس طرح یہ کھڑا ہے۔" ہم ان باتوں کے جوابات تو دیتے مگر امی یہ باتیں کہہ کر رونا شروع کر دیتی تھیں، امی کو روتا دیکھ کر بہنیں بھی رونا شروع کر دیتیں۔ گھر کا ماحول جذباتی ہو جاتا۔

"ماموں! آپ نے ہمارے گھر کا ماحول خراب کر دیا۔" میں نے ماموں کو فون کیا ہوا تھا۔

"فرحان بیٹا... تم سمجھ دار ہو، اس لیے تمھیں بتا رہا ہوں۔ اس تصویر سے بہت مدد ملی ہے۔ میں اس بچے کی نشان دہی کروا رہا ہوں۔ ماں کی شناخت کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔ تصویر اور کامی میں اتنی واضح تبدیلی کے باوجود تمہاری ماں کا یہ کہنا کہ یہی کامی ہے تو شاید کوئی نیا سراغ مل جائے۔ ہمارا کل اٹیک (حملہ) ہے ہم نے تیاریاں مکمل کر لی ہیں، تم دعا کرو، کسی کو کچھ بتانا نہیں۔" ماموں کی ان باتوں سے میرے اندر ہل چل مچ گئی۔ کافی عرصے کے بعد مجھے بھی کامران کی یاد آئی۔

O

اگلے دن مجھے شدت سے انتظار تھا۔ پورا دن گزرنے کے بعد رات آٹھ بجے ماموں کا فون آیا۔

"فرحان بیٹا! تمہارا ماموں بات کر رہا ہوں، ہم نے فقیروں کا گینگ پکڑ لیا ہے۔"

"کیا!!! فقیروں کا گینگ؟" میں چلایا۔

"ہاں! فقیروں کا گینگ۔ میرا کراچی میں رہنا ضروری ہے۔ تمہاری امی سے ملنے کے لیے بھی آنا ضروری ہے، لیکن میں فوری نہیں آسکتا۔"

"تو اب کیا کریں ماموں۔" میں بے صبری سے بولا۔

"انٹیلی جنس کے دو آدمی اس بچے کو چھوڑنے آرہے ہیں جس کو تمہاری ماں کامران سمجھتی ہے۔" ماموں نے مسئلے کو حل کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے خیال میں وہ کامی ہے یا کوئی اور۔" مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

"میں نے کامران کو آج سے آٹھ برس پہلے دیکھا تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ نہیں کہ یہ بچہ کامی ہے یا نہیں۔"

"اب میں کیا کروں! جلدی بتائیں۔" میرے جسم میں بجلیاں چلنے لگیں۔

"تم گاڑی لے کر ائیر پورٹ آجاؤ، اس بچے کو لے جاؤ۔ اگر تمہاری ماں نے تصدیق کردی تو یہ آدمی خود ہی تین گھنٹے بعد والی فلائیٹ سے واپس آجائیں گے، ورنہ اس بچے کو لے کر واپس آجائیں گے۔" ماموں ایک سانس میں بولتے چلے گئے۔ ساتھ ہی سلام کر کے فون بند کر دیا۔

O

ہدایت کے مطابق میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میری گاڑی کے پاس دو جوان آکر رکے۔ اندازے سے وہ فوجی معلوم ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گاڑی کا شیشہ بجایا۔ میں نے شیشہ کھولا۔

"فرحان؟"

"جی۔" ہدایت کے مطابق مختصر سا جواب دیا۔ اس آدمی نے دوسرے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ ایک نو یا دس برس کی عمر کے بچے کو لائے جو کالا کلوٹا اور بالکل دبلا پتلا تھا۔ دروازہ کھول کر اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ میں سکتے کے عالم میں بچے کو دیکھتا رہ گیا۔ کافی دیر گھورنے کے بعد میں اس چہرے میں کامران کو تلاش کر چکا تھا۔ ساتھ ہی فون کی گھنٹی بجی:

"ماموں! یہ کامی ہے۔ کامران! کیا حالت کر دی میرے بھائی کی!" ساتھ ہی میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ میں چیخوں کے ساتھ رونے لگا۔ میں بھائی سے مل کر اپنے جذبات کی پیاس نہیں بجھا سکتا تھا، کیونکہ گاڑی چلا چکا تھا۔ ماموں نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی مگر یہ زخم کسی کے کندھے پر سر رکھے بغیر دھل نہیں سکتا تھا۔ ماموں نے فون بند کر دیا۔

دس منٹ میں گھر پہنچا، گھر میں کہرام مچ چکا تھا۔ ماموں گھر میں اطلاع کر چکے تھے۔ امی کامی کو دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئیں۔ بہنوں کا رو رو کر برا حال ہوگیا۔ کامی منہ سے ایک لفظ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے صرف رونے کی آواز آرہی تھی۔ صرف حال احوال بتا کر خاموش ہوگیا تھا۔ سب رشتہ دار جمع ہو چکے تھے۔ دو برس میں 12 برس کا کامران ظالموں کے ظلم سے ایسا ہوگیا تھا کہ جیسے 9 برس کا بچہ ہو۔ ماں تو ماں ہوتی ہے کہ بچے کو جھلک سے پہچان لیا، میرے لیے ہم سب کے لیے یہ حیرت کی بات تو شاید ہو، لیکن ایک ماں کے لیے اس میں کوئی حیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ آیندہ ہفتے پڑھیں!